اسلامی علوم وتحقیقات اور زبان وادب کا ترجمان ماہنامہ

جلد: ۰۴، شمارہ: ۰۱ صفر المظفر ۱۴۴۳ھ

النخیل کراچی

بانی
ابن الحسن عبّاسی

اسلامی علوم وتحقیقات اور زبان وادب کا ترجمان ماہنامہ

النخیل

جلد: ۰۴، شمارہ: ۱۰ صفر المظفر ۱۴۴۳ھ، ستمبر ۲۰۲۱ء

ادارہ تراث الادب

alnakhil786@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فی شمارہ:.... 60روپے   **سالانہ زرِتعاون :....** 600 روپے

خط وکتابت کا پتہ:.....ادارہ تراث الادب، ۰۷/ دس آر، آریہ نگر، خانیوال

رابطہ نمبر:.......... 03004097744-03444023470

ای میل ایڈریس:alnakhil786@gmail.com

صدائے نخیل

حرفِ آغاز

مدیر کے قلم سے

برصغیر پاک و ہند پر برطانوی استعمار کا تسلط قائم ہونے کے بعد جہاں اس خطے کا سیاسی وسماجی منظر نامہ زیرو زبر ہوگیا، وہیں اس کے علمی، ادبی اور تہذیبی آفاق پر بھی بوقلموں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ان تبدیلیوں کی رفتار ارتقائی اور فطری نوعیت کی نہیں تھی بلکہ عسکری فتح کے نشے سے سرشار ایک قوتِ قاہرہ کی جانب سے مفتوحہ سرزمین پر اپنی تہذیبی برتری کا جھنڈا گاڑنے کی شعوری کوشش تھی۔اس کوشش کے پہلے قدم کے طور پر برصغیر میں صدیوں سے رائج اور وقت کے ساتھ ارتقاء پذیر تعلیمی نظام کو مکمل ''قلب ماہیت'' کے ذریعے ایک ایسے نظام تعلیم سے تبدیل کر دیا گیا جس میں مقامی اقدار، مذہبی واخلاقی تعلیمات اور متوارث علمی وادبی ذخیرے کو نہ صرف یہ کہ نصاب سے نکال دیا گیا بلکہ نئی نسل کو ان اقدار وروایات سے دور کرنے کی منصوبہ بند حکمت عملی بنائی گئی۔لارڈ میکالے کا برطانوی دار العوام کے سامنے دیا گیا یہ بیان بہت ہی مشہور ہے کہ:

> ''ہم نے ہندوستان کے لیے ایسا نصابِ تعلیم وضع کر دیا ہے کہ جس کے پڑھنے والے اگر عیسائی نہ بن سکے تو ہندوستانی بھی نہیں رہیں گے۔''

ہندوستان کی دیگر اقوام اور مذاہب بھی اس تہذیبی یلغار کی زد میں آئے مگر اس کا اصل ہدف اور نشانہ مسلمان ہی تھے کیونکہ انگریزوں نے اقتدار ان ہی سے چھینا تھا، دوسرے یہ کہ اسلام ہی وہ دین تھا اور ہے جو اپنا ایک جامع تمدنی نظام اور غیر مبدل اخلاقی تعلیمات رکھنے کی وجہ سے مغربی تہذیب کے لیے چیلنج بن سکتا تھا۔

برطانوی استعمار کی اس تہذیبی یلغار کے مقابلے میں مسلمانوں کے دو نقطہ ہائے نظر سامنے آئے۔سرسید احمد خان اوران کے ہم نوا حضرات کا خیال یہ تھا کہ برصغیر پر انگریزوں کی حکومت کا قیام ایک تکوینی امر ہے اوراب جبکہ انگریز قابض ہوہی چکے ہیں تو مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ انگریزی حکومت اوراس کی لائی ہوئی مغربی تہذیب کے ساتھ تصادم اور بغاوت کا طرزِعمل اختیار کرنے کی بجائے مفاہمت اور مصالحت کی راہ اپنائیں اورانگریزی نظام تعلیم کوخوش دلی سے اپنالیں تا کہ آگے چل کر وہ ملک کی انتظامی مشینری کا حصہ بن سکیں اور دیگراقوام بالخصوص ہندوؤں سے پیچھے نہ رہیں۔جبکہ دوسری جانب مولانا محمد قاسم نانوتوی ،مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے کچھ علماء تھے جن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مکمل طور پر انگریزی نظام تعلیم کا حصہ بننا مسلمانوں کے لیے زہر قاتل ثابت ہوگا اور یہ کہ مسلمانوں کے لیے بہتر لائحہ عمل یہ ہے کہ وہ اپنے تعلیمی ادارے بنائیں جہاں خالص اسلامی علوم کی تعلیم ہواور جن کا مقصد مسلمانوں کے تہذیبی تشخص کی بقاءاور تحفظ ہو۔

یہ دونوں نقطۂ نظر متوازی چلتے رہے۔مسلمان عوام کی اکثریت نے مکتبِ سرسید کی پیروی اختیار کی اورعلی گڑھ تحریک کا ساتھ دے کر انگریز سرکار کی سرپرستی میں جدید تعلیم کے حصول کو ترجیح دی جبکہ دوسری طرف علماء کے طبقے نے دارالعلوم دیوبند جیسے ادارے قائم کر کے خالص دینی علوم کی تعلیم وتدریس کا بیڑا اٹھایا۔یہ دونقطہ ہائے نظر دریا کے دو پاٹوں کی طرح متوازی چلتے رہے۔کئی مواقع پر دونوں مکاتب کے لوگ ایک دوسرے کے نزدیک بھی آئے۔خلافت تحریک اورتحریکِ پاکستان میں دونوں کے اکابر شانہ بشانہ رہے مگر اس کے باوجود چونکہ دونوں مکاتب کے فکری منہج میں اختلاف اساسی نوعیت کا تھا،اوردونوں نظام ہائے تعلیم کے سانچے ہی باہم مختلف اور متضاد تھے،اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلم سماج میں دو الگ فکری طبقات وجود میں آئے،اگر مثال دی جائے تو ایک طبقہ گویا خالص مادہ تھا جبکہ دوسرا مجرد روح۔جبکہ افراد کی طرح قوموں کی زندگی بھی مادہ اور روح کے امتزاج اورتوازن سے عبارت ہوا کرتی ہے۔خاص طور پر مسلم سماج کی ترکیب تو محض مادہ پرستی یا مجرد روحانیت یعنی رہبانیت سے ممکن نہیں ہے۔

آج ہمارے معاشرے کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان تفریق اور تقسیم کے جہاں اور بہت سے عوامل واسباب ہیں، وہیں مذکورہ بالا دو الگ الگ فکری سانچوں میں ڈھل کر سامنے آنے والی نسلوں کے درمیان ذہنی فاصلہ بعد المشرقین کی مسافت پر پہنچ چکا ہے۔ زندگی کے دیگر شعبوں کو ایک طرف رکھ کر اگر صرف علم وادب کے شعبے کو ہی لے لیا جائے تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ ایک ہی فضا میں پرواز کے باوجود دونوں طبقات کے جہاں ہی الگ الگ ہیں۔

ادب کی جملہ اصناف مثلاً نثر، نظم، لغت، ترجمہ، مقالہ نویسی، کالم نگاری، سفر نامہ نویسی، خاکہ نویسی وغیرہ میں دونوں طبقات کے لوگ اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے ہیں، بعض اصناف میں شاید طبقہ علماء کی تحقیقات ونگارشات دیگر طبقات کے مقابلے میں زیادہ ہی ہوں مگر اس کے باوجود ہمارے ادبی دبستانوں میں علماء کی کاوشوں کا تذکرہ کم کم ہی ہوتا ہے۔ اس میں علماء کے اپنے طرزِ فکر کا بھی بڑا عمل دخل ہے کہ علمی وادبی تخلیقات کی تشہیر ورونمائی کی وہ چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتے بلکہ اسے اخلاص کے تقاضوں کے خلاف گردانا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے جید علماء کی شاہکار تصنیفات بھی ایک خاص طبقے تک محدود رہ جاتی ہیں۔ دوسری جانب عام ادیبوں اور لکھاریوں کی اچھی کاوشیں بھی بوجوہ طبقہ علماء تک نہیں پہنچ پاتیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دونوں طبقات علمی وادبی میدان میں ہم سفر ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے اجنبی رہ جاتے ہیں اور یہ اجنبیت بعض دفعہ وحشت ونامانوسیت کے بعض افسوس ناک مظاہر کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

ہمارے مخدوم اور محسن مولانا ابن الحسن عباسی رحمہ اللہ نے آج سے چند سال قبل ادبی دنیا میں پائے جانے والی اس خلیج کو پاٹنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور اسی مقصد کے تحت ماہنامہ ''النخیل'' کا اجرا کیا تھا۔ ماہنامہ ''النخیل'' نے ماشاءاللہ بہت تھوڑے عرصے میں نہ صرف پاکستان بلکہ پورے برصغیر کے علمی وادبی حلقوں میں اپنی اچھی جگہ بنائی اور بالخصوص اس کے ''مطالعہ نمبر'' نے بڑی زبردست مقبولیت پائی۔ گزشتہ دو برسوں کے دوران کورونا کی آزمائش نے جہاں دنیا کے ہر شعبے کو متاثر کیا، وہیں علمی وادبی رسائل وجرائد کے لیے بھی اپنی اشاعت کا تسلسل باقی رکھنا مشکل ہوگیا۔ پھر

''النخیل'' کے ساتھ سب سے بڑا سانحہ یہ پیش آیا کہ اس کے بانی اور روح ورواں حضرت مولانا ابن الحسن عباسی طویل عرصے تک علیل رہنے کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے:

آن قدح بشکست وآن ساقی نماند!

مولانا کی وفات حسرت آیات کے ساتھ جہاں ان کے قائم کردہ دیگر ادارے یتیم ہو گئے، وہیں النخیل کا چراغ بھی ٹمٹمانے لگا۔مگر داد دی جانی چاہیے مولانا ابن الحسن عباسی کے دستِ راست اور ''النخیل'' کے معاون مدیر نوجوان فاضل محمد بشارت نواز کو کہ انہوں نے مولانا ابن الحسن عباسی کے لگائے گئے اس ادبی نخلستان کو ہرا بھرا رکھنے کی حامی بھری اور یہ انہی کی کوشش اور فکر کا نتیجہ ہے کہ آج ''النخیل'' ایک بار پھر ایک ادبی گلدستے کی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

بندہ پر مولانا ابن الحسن عباسی کا یہ قرض ہے کہ انہوں نے لکھنے لکھانے کی تھوڑی بہت مشق کے دوران ہر قدم پر بندہ کی حوصلہ افزائی فرمائی، قیمتی نصیحتوں سے نوازا اور از راہِ خورد نوازی بندہ کا نام بھی ''النخیل'' کی مجلسِ مشاورت میں شامل کیا۔اس قرض کی ادائی مولانا جیسے منجھے ہوئے ادیب ومصنف کی نیابت کی صورت میں تو ممکن نہیں ہے کہ بندہ میں اتنی صلاحیت و استعداد ہی نہیں ہے تاہم محمد بشارت نواز کے اصرار پر بندہ نے اس جریدے کی ادارت کے سلسلے میں اپنی استعداد اور تجربے کے مطابق ہر ممکن تعاون کو اپنا فرض سمجھ کر قبول کیا ہے۔

ہمیں اہل علم اور اہل قلم حضرات کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔اللہ تعالیٰ ہمارا حامی وناصر ہو۔

محمد شفیع چترالی

۱۱ صفر ۱۴۴۳ھ

☆......☆......☆

کتابیں ہیں چمن اپنا

فتاویٰ تاتارخانیہ

مفتی محمد ساجد میمن

["کتابیں ہیں چمن اپنا" اس عنوان کے تحت ہر ماہ اسلامی علوم کے بنیادی مصادر و مراجع میں سے کسی ایک اہم کتاب کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ادارہ]

کچھ مؤلف کے بارے میں: حیرت اور باعثِ تعجب ہے کہ مؤلف کتاب کے تذکرے سے تاریخی اور فقہی تمام کتب خاموش ہیں،اسی طرح وہ کتب جو خاص مؤلفین و مصنفین کے احوال پر لکھی گئی ہیں،ان میں بھی مؤلف کے بارے میں خاص معلومات مذکور نہیں۔ چند ایک کتاب میں مختصر سا تذکرہ کیا گیا ہے، جو یہ ہے:

آپ کا نام فرید الدین عالم بن علاء اِندرپتی دھلوی ہے۔آپ کا شمار اپنے وقت کے نابغۂ روزگار علماء وفقہاء میں ہوتا تھا، فقہ، اصولِ فقہ اور عربی ادب میں آپ کو مہارت وملکہ تامہ حاصل تھا۔ ۷۷۷ھ میں فتاویٰ تاتارخانیہ کی تالیف سے فارغ ہوئے۔آپ کی وفات سلطان فیروز تغلق کے دورِ حکومت ۷۸۶ھ میں ہوئی۔(۱)

حاجی خلیفہ کا تسامح: کشف الظنون میں حاجی خلیفہ نے فتاویٰ تاتارخانیہ کا دو جگہ تذکرہ کیا ہے:

(۱)......تاتارخانیہ فی الفتاویٰ کے تحت۔(۲)

(۱)......"زاد المسافر" کے تحت، اس دوسرے مقام پر حاجی خلیفہ سے مؤلف کی تاریخ وفات کی بابت سہو ہوا ہے، آپ لکھتے ہیں:

"زادالمسافر" فی الفروع، وھو المعروف بالفتاویٰ التاتارخانیة لعالم بن العلاء الحنفی، المتوفی ۲۸۶ھ ست وثمانین ومائتین۔"(۳)

مؤلف کا سنِ وفات ۲۸۶ھ قرار دینا سہو ہے، کیوں کہ یہ بات واضح ہے کہ مؤلف نے یہ کتاب ’’فیروز شاہ تغلق‘‘ کے دور حکومت میں لکھی اور ان کا دور حکومت ۷۵۲ھ سے ۷۹۲ھ پر مشتمل ہے۔(۴)

علامہ عبدالحئی لکھنویؒ حاجی خلیفہ کے اس تسامح کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یعنی ’’مؤلف کے سن وفات کے بارے میں مصنفِ کشف الظنون کو ’’۷‘‘ اور ’’۲‘‘ کے عدد میں التباس ہوگیا ہے، اس لئے کہ یہ دونوں عدد تقریباً ہم شکل ہیں‘‘۔(۵)

’’اندر پت‘‘ کی تحقیق: مؤرخین کی رائے سے معلوم ہوتا ہے کہ ’’دہلی‘‘ کا قدیم نام ’’اندر پت‘‘ تھا، بعد میں اس میں تبدیلی آئی اور اس کا نام دہلی ہوگیا۔ سر سید احمد خان ’’اندر پت‘‘ کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’پہلے ’’اندر پرست‘‘ اس میدان کا نام تھا جو پرانے قلعہ اور درے کے خونی دروازے کے درمیان میں ہے۔ ہندوؤں کے اعتقاد میں ’’اندر‘‘ نام ہے اکاس کے راجہ کا جو ہندوؤں کے مذہب میں ایک مقرری راجہ ہے اور ’’پرست‘‘ کہتے ہیں دونوں ہاتھوں کے ملے ہوئے لبوں کو، ہندوؤں کے اعتقاد میں یہ بات ہے کہ جہاں راجہ اندر نے کسی فرضی زمانے میں دونوں ہاتھ بھر کر موتیوں کا دان کیا تھا، اس سبب سے اس جگہ کو ’’اندر پرست‘‘ کہتے ہیں۔ کثرت استعمال سے رے اور سین حذف ہوگیا اور اندر پت مشہور ہوگیا۔ مگر میری سمجھ میں یہ معنی تو ایسے ہی ہیں جیسے اور ہندوؤں کی کہانیاں،...... صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ’’پت‘‘ کے معنی صاحب اور مالک اور حاکم کے ہیں، جب یہ شہر آباد ہوا تو آباد کرنے والے نے نیک فال سمجھ کر ’’اندر پت‘‘ نام رکھا یعنی اس شہر کا مالک یا حاکم ’’اندر‘‘ ہے جو اکاس اور مہشت کا راجہ ہے۔ پہلے زمانے میں یہاں کے راجاؤں کی تخت گاہ ہستنا پور تھا، گنگا کے کنارے دلی سے تخمیناً سو میل دور ہے، جب راجہ جد ہشتر اور راجہ جر جودھن میں بگاڑ ہوا تو راجہ جد ہشتر نے یہ شہر آباد کیا۔ ہندی حسان کے بموجب یہ جھگڑا دواپر جگ کے اخیر اور کلجگ کی ابتدا یعنی تین ہزار ایک سو اکیس سال قبل ولادت حضرت مسیح ہوا مگر یہ زمانہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ مدت طوفان سے بھی پہلے کی ہے، صحیح حساب سے یوں تحقیق ہوا ہے کہ واقعۂ مہابھارت اور راجہ جد ہشتر کی

مسند نشینی ایک ہزار چارسو پچاس سال تخمیناً قبل حضرت مسیح ہوئی پس اس شہر کے آباد ہونے کا یہی صحیح زمانہ ہے، اگر چہ اب اس شہر کا نشان باقی نہیں رہا لیکن شاہجہاں آباد کے جنوب کی طرف دلی دروازے کے باہر جو زمین ہے، اندر پت کی زمین کہلاتی ہے مگر خاص اندر پت کی آبادی اب نہیں رہی، ساری زمین میں زراعت ہوتی ہے اور وہاں کے زمیندار پرانے قلعے میں بستے ہیں اور یہ سب سے پہلا شہر ہے جو یہاں آباد ہوا اس کے بعد اور آبادیاں اس کے آس پاس ہوتی رہیں ہیں''۔

اب سوال یہ ہے کہ اندر پت کا نام دہلی کس طرح اور کب ہوا؟ اس بارے میں تحقیق کرتے ہوئے سر سید احمد خان ''دہلی'' کے عنوان کے تحت (مختلف اقوال ذکر کرنے کے بعد) لکھتے ہیں:

''......مشہور بات جو صحیح بھی معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ دہلو قلوج کے راجہ نے، اس سبب سے کہ دہلی کے اکثر راجہ قنوج کے تابع رہے ہیں، اندر پت میں اپنے نام پر شہر بسایا، جب سے اس کا نام دہلی مشہور ہوا، بل کہ اصل نام ''دہلی'' کا ''دہلو'' ہے (پھر ''واؤ''، ''یا'' سے تبدیل ہو گیا)۔ (۶)

ڈاکٹر بشیر احمد ''اندر پت'' کے محل وقوع کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اندر پرستھ، دہلی کا قدیم نام ہے، اس کی حدود ''اوکھلا'' سے شروع ہو کر ''برابری'' نامی بستی پر ختم ہوتی ہے''۔(۷)

امیر ''تاتار خان'': کتاب کا تعارف کرانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امیر تاتار خان کا بھی تعارف سامنے آجائے، جن کی ایماء و فرمائش پر یہ عظیم الشان کتاب منصۂ شہود پر آئی۔

جناب محمد اسحاق بھٹی صاحب ''تاریخ فیروز شاہی'' کے حوالے سے امیر تاتار خان کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''معتبر روایت ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد حکومت میں خراسان کے ایک صاحب جاہ و حشم فرماں روا نے ملتان اور دیپال پور پر حملہ کر کے اس نواح کو تاخت و تاراج کیا۔ یہ (حملہ آور) بادشاہ اپنی ایک زوجہ پر جو بے حد صاحبِ حسن و جمال تھی، اس درجہ شیدا تھا کہ اس کو کبھی اپنے سے جدا نہیں کر سکتا تھا۔ اس مہم میں یہ زوجہ بادشاہ

کے ہمراہ تھی اور حاملہ تھی۔ ملتان و دیپال پور میں قدم رکھتے ہی اس بیگم کے بطن سے بچہ پیدا ہوا۔ اتفاق سے اس شب سلطان تغلق نے خراسانی لشکر پر شب خون مارا اور قتل عام شروع کر دیا۔ خراسانی لشکر نے شکست کھائی اور ہر شخص نے راہ فرار اختیار کی اور پریشانی کے عالم میں اس بچے کو گھوارے میں چھوڑ دیا...... سلطان تغلق کا لشکر، مال غنیمت کو ہر جانب تلاش کر رہا تھا کہ ان کی نظر اس گھوارے پر پڑی۔ گھوارہ مع بچے کے بادشاہ کے روبرو لایا گیا۔ سلطان تغلق نے اس نوزائیدہ بچے کو دیکھ کر بے حد پسند کیا۔ بادشاہ نے اس خوش نصیب بچے کی باپ کی طرح پرورش شروع کی...... سلطان تغلق نے اس فرزند کو تاتار ملک کے نام سے موسوم کیا جو اس عہد میں خُرد سال تھا۔ یہ بچہ جوان ہوا اور سلطان محمد تغلق کے عہد حکومت میں جوان ہو کر مشہور زمانہ ہوا۔ یہ لڑکا دلاوری و زور آزمائی اور شجاعت و بہادری میں یکتائے زمانہ ہوا اور محمد تغلق کے عہد حکومت میں لشکر کشی و فتوحات ملکی میں نادر روزگار خیال کیا جانے لگا، اس شخص نے اپنے زور بازو سے کئی ممالک فتح کیے۔

فیروز شاہ صحن گلبن کے محل میں دربار کرتا اور بادشاہ کے دائیں جانب جو وزرا کے لیے مخصوص ہے، تاتار خاں کو جگہ عطا ہوئی اور بادشاہ کے بائیں جانب خان جہان مقبول کی جگہ مقرر ہوئی۔ اگرچہ خان جہان مقبول وزیر تھا لیکن بادشاہ کے دائیں جانب تاتار خان ہی کو جگہ عنایت ہوئی۔ تاتار خان کی رحلت کے بعد یہ جگہ خان جہان مقبول کو عطا ہوئی۔ فیروز شاہ کو تاتار خان پر کلی اعتماد تھا اور بادشاہ امور ملکی میں ہمیشہ تاتار خان سے مشورہ لیا کرتا اور اس امیر کی رائے کے مطابق مہماتِ ملکی کا فیصلہ کرتا اور ان کی بابت احکام جاری کرتا تھا۔ خان، مذکورہ بادشاہ کا بہی خواہ اور خیر اندیش تھا اور اس کی فطرت بے حد عمدہ و سلیم واقع ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس امیر کو بے شمار صفات سے آراستہ کیا تھا۔ تاتار خان نے توفیق الٰہی سے ملک حجاز کا سفر کیا اور حرمین شریفین کی زیارت کے بعد ہندوستان واپس آیا۔ اس امیر کی صحبت میں ہمیشہ علماء و فضلا کا مجمع رہتا اور تاتار خان اس مقدس گروہ کی عزت کرتا۔ ''تفسیر تاتار خانی'' جو بہترین و مشہور زمانہ تفسیر ہے، اسی کی جمع کردہ ہے۔

غرض اس امیر کے تمام افعال پسندیدہ تھے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو ہر طرح کی خوبی سے آراستہ فرمایا تھا۔ تاتارخان نے جلوسِ فیروز شاہی کے چند سال بعد وفات پائی''۔(۸)

زیرِ تعارف کتاب: کتاب کا اصل نام ''زادالسفر'' یا ''زادالمسافر'' ہے لیکن چونکہ مؤلف نے یہ کتاب فیروز شاہ تغلق کے وزیر با تدبیر اور فوجی جرنیل ''تاتارخان'' کے ایماء اور فرمائش پر لکھی ہے، اس لیے اس کی طرف منسوب کرتے ہوئے اس کا نام '' فتاویٰ تاتارخانیہ'' رکھا۔ مؤلف اور امیر تاتارخان کے مابین گہری دوستی تھی اور امیر تاتارخان ایک باذوق اور علمی انسان تھا، اس نے مؤلفؒ سے درخواست کی کہ فقہ کے موضوع پر ایک جامع کتاب مرتب کی جائے جو فقہ حنفی کے تمام مسائل پر حاوی ہو۔ مؤلفؒ نے امیر تاتارخان کی رغبت اور اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے کتاب لکھنے کا عزم کیا، امیر تاتارخان نے بھی مؤلف کو مکمل تعاون کی یقین دہانی کروائی اور اس وقت فقہ حنفی کی جتنی کتابیں مطبوعہ یا مخطوطہ صورت میں جہاں کہیں بھی موجود تھیں، وہ مؤلف کی خدمت میں پیش کیں لیکن افسوس کہ امیر تاتارخان اپنی حیاتِ مستعار میں اس کتاب کو پورا ہوتا نہ دیکھ سکا اور اس کی وفات کے بعد ۷۷۷ھ میں کتاب پایہ تکمیل کو پہنچی۔ علامہ عبدالحئیؒ لکھنوی فتاویٰ تاتارخانیہ کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عالم کبیر شیخ فریدالدین عالم بن العلاء حنفی اندرپتی کا شمار فقہ، اصولِ فقہ اور عربی کے ممتاز علماء میں ہوتا ہے، ان کی ایک تصنیف ''فتاویٰ تاتارخانیہ'' ہے جس کا اصل نام ''زاد السفر'' ہے۔ یہ کتاب سن ۷۷۷ھ میں امیر تاتارخان کے حکم پر تصنیف کی، جس کی بنا پر اس کی طرف اس کو منسوب کر دیا۔ بادشاہ فیروز شاہ کا مطالبہ تھا کہ یہ کتاب اس کی طرف منسوب کی جائے لیکن مصنفؒ نے اس کو قبول نہ کیا''۔(۹)

حاجی خلیفہ کشف الظنون (۱/ ۳۲۲) میں لکھتے ہیں:

''هو كتاب عظيم في مجلدات جمع فيه مسائل المحيط البرهاني، والذخيرة، و الخانية، والظهيرية، وجعل الميم علامة للمحيط، وذكر اسم الباقي، وقدّم بابا في ذكر العلم، ثم رتّب على أبواب الهداية، وذكر أنه أشار إلى جمعه الخان

الأعظم "تاتارخان" ولم یسم ولذلک اشتهر به، وقيل: إنه سمّاه "زاد المسافر"۔

سببِ تالیف: مؤلف نے مقدمہ میں کتاب کا سبب تالیف ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"... فقد أشار إليّ مَن إشارته حكم، و طاعته غنم، و أمره يتلقى ... أن أتشمّر لجمع كتاب جامع الفتاوى و الواقعات حاوي الروايات..."

یعنی "مجھے اس کتاب کے لکھنے کا حکم امیر تاتارخان نے دیا کہ ایک ایسی کتاب لکھی جائے جو فقہ حنفی کے تمام مسائل کو حاوی ہو اور اس قدر جامع ہو کہ لوگوں کو دوسری کتابوں سے مستغنی کردے، لہٰذا میں نے امتثالاً للامر فقہ حنفی کی چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابوں کو سامنے رکھ کر یہ مجموعہ تیار کیا"۔

مراجع ومصادر: اس کتاب کی تیاری میں مؤلفؒ کے پیش نظر تقریباً ۱۳۰ کتابیں تھیں، جن میں سے ۳۰ کا ذکر خود مؤلف نے مقدمہ میں کیا ہے، فرماتے ہیں:

"فجمعت من كل ضخم، و لطيف حجم، من المحيط، والذخيرة، والفتاوى الخانية، والظهيرية، والخلاصة، وجامع الفتاوى، والتجريد، والتفريد، والنوازل، والهداية، وشرحَيها، والوقاية، والحاوي، والفتاوى العتابية، والغياثية، والصيرفية، والسراجية، والنسفية، والحجة، والتهذيب، وجامع الجوامع، وفتاوى الناطفي، وخزانة الفقه، والكبرى، والصغرى، والينابيع، والملتقط، والمختار، والمضمرات، والعيون"۔

یہ تیس کتب تو وہ ہیں جن کا خود مؤلف نے تذکرہ کیا ہے، اس کے علاوہ تحقیق وتتبع کے نتیجے میں جو کتب سامنے آئیں ہیں ان کی تعداد تقریباً ۱۰۰ ہے، جن کا ذکر محقق نے اپنے مقدمہ میں کیا ہے۔

کتاب کی ترتیب: کتاب کی ابتداء میں مؤلفؒ نے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے جو مندرجہ ذیل سات فصول پر مشتمل ہے:

☆......**الفصل الأول: في فضيلة العلم۔** ☆......**الفصل الثاني: في فضل العلم و الفقه، و العالم و المتعلم، و التعليم و التعلّم۔** ☆......**الفصل الثالث: في فرض العين و الكفاية من العلوم۔** ☆......**الفصل الرابع: في آفة العلم۔** ☆......**الفصل الخامس: في بيان السنة**

والجماعة۔ ☆……الفصل السادس: فیمن یحل له الفتوی و من لایحل له۔☆……الفصل السابع: في آداب المفتي و المستفتي۔

”**کتاب الطهارة**“ تا ”**کتاب الوصایا**“، مکمل فقہی احکام ومسائل کا ذخیرہ ہے، مسائل نقل کرنے میں مؤلف نے مندرجہ ذیل چار امور کا اہتمام والتزام کیا ہے:

(۱):……جن جن کتب سے مسائل نقل کئے ہیں، ان کے نام صراحۃً ذکر کئے ہیں۔

(۲):……صرف نقل مسائل پر ہی اکتفا کیا ہے، نصوص ودلائل کے ذکر کرنے کا اہتمام نہیں کیا۔

(۳):……بعض اوقات ایک مسئلے کو مختلف کتب سے ذکر کرتے ہیں تو اس صورت میں ہر کتاب کا نام ذکر کرتے ہیں۔

(۴):……نقل مسائل کے لئے چونکہ مصنف نے ”**محیط برهانی**“ (مؤلفہ برہان الدین محمود بن احمد مازہ بخاری متوفی ۶۱۶ھ) کو اصل بنیاد بنایا ہے، اس بنا پر نقل مسائل میں اس کا ذکر بکثرت آتا ہے تو اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ”میم“ کا رمز استعمال کرتے ہیں۔

کتاب کے مسائل وابواب کی ترتیب ”**هدایه**“ کے مطابق ہے، مؤلف **علام** لکھتے ہیں:

”ورَتّبت أبوابه علی ترتیب الهدایة“۔

مسائل کی تعداد: ہر جلد کی ابتدا میں بیس جلدوں میں موجود ابواب کی ایک اجمالی فہرست دی گئی ہے، جس میں ہر جلد میں مذکور مسائل کی تعداد کا اندازہ ہوتا ہے، اس فہرست کے مطابق پوری کتاب میں ۳۳۷۷۸ مسائل ہیں۔ یہ تو صرف وہ تعداد ہے جو اہم مہم مسائل پر نمبر لگانے سے معلوم ہوتی ہے، ہر ہر مرقوم مسئلہ کے ذیل میں دسیوں مسائل ہیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب لاکھوں مسائل کا مجموعہ اور فقہ حنفی کا عظیم الشان انسائیکلو پیڈیا ہے۔

مؤلف کا اسلوب وانداز: سب سے پہلے ”**کتاب**“ کا عنوان قائم کرتے ہیں، اس کے بعد متعلقہ ”**کتاب**“ کی لغوی، اصطلاحی تعریف کرتے ہیں، اس کے بعد اہم مہم مسائل اور اقسام وغیرہ کو ”**الخلاصة**“ کے عنوان سے ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد وہ ”**کتاب**“ جتنی ”**فصول**“ پر مشتمل ہے، اس کی تعداد ذکر کرتے ہیں، پھر ”**الفصل الأول**“، ”**الفصل الثانی**“۔۔۔کا عنوان قائم کرتے ہیں، اور ہر ہر فصل

کے تحت جتنے مسائل ہیں ان کو ''أنواع'' پر تقسیم کرتے ہیں، ترتیب اس طرح ہے:

''كتاب الطهارة... المضمرات : الطهارة في اللغة: النظافة، وفي الشرع : عبارة عن غسل الأعضاء مخصوصة بصفة مخصوصة، الخلاصة:اعلم بأن الطهارة شرط جواز الصلاة ... هذا الكتاب يشتمل على تسعة فصول ...الفصل الأول :في الوضوء، وهو يشتمل على أنواع: نوع منه في بيان فرائضه:فنقول: فرض الوضوء: غسل الوجه... نوع منه في تعليم الوضوء... نوع منه في بيان سنن الوضوء وآدابه''...هكذا إلى آخره۔

''فتاویٰ تاتارخانیہ'' پر تحقیقی کام کی تفصیل: فتاویٰ تاتارخانیہ پر اب تک تین مرحلوں میں کام ہوا ہے۔ ابتدائی دو مراحل میں کام اپنی انتہاء کو نہ پہنچ سکا اور آخری مرحلہ میں یہ کام مکمل ہو گیا، اب تک جو کام ہوئے، اس کی تفصیل یہ ہے:

پہلا مرحلہ: شیخ ابراہیم بن محمد حلبیؒ (متوفی ۹۵۶ھ) نے ایک جلد میں فتاویٰ تاتارخانیہ کی تلخیص کی ہے اور ایسے نادر اور کثیر الوقوع مسائل کا انتخاب کیا ہے جو کتب متداولہ میں نہیں ہیں اور ہر مسئلے کے لیے کتب کا حوالہ بھی دیا ہے، جیسا کہ حاجی خلیفہ نے لکھا ہے:

''ثم إن الإمام إبراهيم بن محمد الحلبي المتوفى سنة ست و خمسين و تسع مائة، لَخّصه في مجلّد و انتخب منه ماهو غريب أو كثير الوقوع وليس في الكتب المتداولة، والتزم بتصريح أسامي الكتب، وقال :متى أطلق الخلاصة فالمراد بها شرح التهذيب، وأما المشهورة فتقييد بالفتاوى''۔(۱۰)

یہ کتاب مخطوطہ اور مطبوعہ دونوں صورتوں میں موجود نہیں ہے۔

دوسرا مرحلہ: مدرسہ عالیہ دہلی کے رئیس، محقق قاضی سجاد حسین بجنوریؒ (متوفی: ۱۴۱۰ھ، ۱۹۹۰ء) نے پروفیسر خلیق احمد نظامی کے توجہ دلانے پر اس کتاب کی تحقیق و تنقیح شروع کی، ''كتاب الطهارة'' سے ''كتاب البيوع'' کے ''باب بيع التلجئة'' تک آپ کی تحقیق پہنچی تھی کہ آپ کا وقت موعود آ پہنچا اور یہ کام نامکمل رہ گیا ہے۔ ''كتاب الطهارة'' تا ''كتاب الوقف'' تک پانچ جلدوں میں آپ کا تحقیق کردہ حصہ ہندوپاک کے مختلف مکتبوں سے چھپ چکا ہے۔

تیسرا مرحلہ: اب یہ تیسرے مرحلے میں پایہ تکمیل کو پہنچی ہے جو مفتی شبیر احمد قاسمی صاحب مدظلہ (شیخ الحدیث ورئیس دارالافتاء جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد، ہندوستان) کی تگ ودو اور محنت وجستجو کے بعد ہماری دسترس میں ہے۔

پیش نظر نسخہ: اس وقت ہمارے پیش نظر مفتی صاحب موصوف کا تحقیق شدہ نسخہ ہے جسے پاکستان میں مکتبہ فاروقیہ، کوئٹہ نے ۲۳ جلدوں میں شائع کیا ہے، آخری تین جلدیں فہرست پر مشتمل ہیں۔ فاضل محقق نے کتاب کی تحقیق وتعلیق میں درج ذیل امور کا اہتمام کیا ہے:

(ا):......مخطوطات کی طرف مراجعت کا خصوصی اہتمام کیا ہے، دورانِ تحقیق محقق کے پیش نظر چھ نسخے تھے:

(الف) مخطوطہ قسطنطنیہ: یہ مخطوطہ مکمل ہے اور ۸ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی کتابت کے واضح ہونے کی بنا پر فاضل محقق نے اسی مخطوطے کو بنیاد بنا کر تحقیقی عمل سرانجام دیا ہے۔

(ب) مکتبہ رضا کانپور، انڈیا میں موجود مخطوطہ: یہ مخطوطہ جہازی سائز کی دو جلدوں میں ہے، اس مخطوطے میں بھی اغلاط کم ہیں لیکن خط بہت باریک ہے جس کی بناء پر پڑھنا دشوار ہے۔

(ج) سالار جھنگ میں محفوظ مخطوطہ: اس کا خط عمدہ اور صاف ہے لیکن اکثر جگہ عبارت واضح نہیں، جس کی بنا پر غلطی کا اندیشہ ہے، اغلاط کی تو بھرمار ہے۔ فاضل مؤلف فرماتے ہیں کہ کثرتِ اغلاط کی بنا پر اس نسخہ پر بالکل اعتماد واعتبار نہیں کیا۔

(د) مکتبہ خدا بخش، پٹنہ، بہار میں موجود مخطوطہ: اس کا خط بھی واضح اور صاف ہے لیکن تمام الفاظ غیر منقوط ہیں اور غلطیاں بھی کافی ہیں۔

(ھ) مخطوطہ نشاشیبی: اس کا خط عجیب وغریب اور بے ڈھنگا ہے۔ جس کی بنا پر اس سے استفادہ کرنا مشکل ہے۔

(و) قاضی سجاد حسین کا تحقیق شدہ مطبوعہ نسخہ: فاضل محقق فرماتے ہیں کہ اس مطبوعہ نسخہ سے جس قدر ہوسکا خوب نفع اٹھایا۔

فتاویٰ تاتارخانیہ کی اس عظیم الشان خدمت پر فاضل محقق اہل علم کی جانب سے مبارکباد کے مستحق

ہیں۔ وقت تالیف سے لے کر آج تک اس شاندار انداز میں یہ کتاب منصۂ شہود پر نہیں آئی۔ مصنف کے زمانہ تصنیف سے آج تقریباً ساڑھے چھ سو سال بعد تحقیق و تعلیق کے زیور سے آراستہ ہو کر یہ کتاب طبع ہو کر پر آئی ہے، محقق موصوف نے اس کتاب کی تحقیق تعلیق میں مسلسل تین سال محنت کی ہے، ان کی یہ خدمت علماء وفقہائے اسلام کی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل ہے۔ جزاہ اللہ عنا و عن جمیع المسلمین أحسن الجزاء



حوالہ جات:

(۱)(نزھة الخواطر:۲/۱۴۸، دار ابن حزم، کشف الظنون: ۱/۳۲۲، دار الکتب العلمیة، بیروت، ھدیة العارفین: ۲/۳۰۹، دار إحیاء التراث العربی، بیروت، معجم المؤلفین: ۵/۵۲، دار إحیاء التراث العربي، بیروت)

(۲)(کشف الظنون: ۱/۳۲۲)

(۳)(کشف الظنون: ۲/۲۴۸)

(۴)(تاریخ فرشتہ: ۱/۳۱۹، ۳۲۸، المیزان، لاہور)

(۵)(نزھة الخواطر: ۲/۱۷۰)

(۶)(آثار الصنادید: دوسرا باب، ص:7,6)

(۷)(واقعات دار الحکومت دہلی، ص:20)

(۸)برصغیر میں علم فقہ: ۱۴۰، کتاب سرائے، لاہور، نزھة الخواطر: ۲/۱۴۸)

(۹)(نزھة الخواطر: ۲/۱۶۹)

(۱۰)(کشف الظنون: ۱/۳۲۲)

میرا مطالعہ

میرا علمی اور مطالعاتی سفر

پروفیسر محمد یونس خان میو

[النخیل کا "مطالعہ نمبر" شائع کرنے کا فیصلہ ہوا تو مطالعہ کے حوالے سے ایک سوالنامہ مرتب کر کے ممتاز اہل علم کے پاس بھیجا گیا، تقریباً سب ہی نے جوابات لکھے، البتہ کئی مضامین تاخیر سے موصول ہونے کے باعث مطالعہ نمبر کی "پہلی اشاعت" میں شائع نہیں ہو سکے، ان مضامین کو "میرا مطالعہ" کے عنوان کے تحت ہر ماہ پیش کیا جا رہا ہے۔ زیرِ نظر مضمون پروفیسر محمد یونس خان میو صاحب کا ہے، آپ کا مختصر سوانحی خاکہ پیشِ خدمت ہے:
تاریخ پیدائش: ۵ جنوری ۱۹۶۳ء، آبائی وطن: گھڑتل، سیالکوٹ، مادر علمی: پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ آپ گورنمنٹ کالج آف کامرس، گجرانوالہ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ آپ نے "مکالمہ بین المذاہب میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا اسلوب" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا۔ ملک کے نامور اخبارات و مؤقر مجلّات میں آپ کے علمی و تحقیقی مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ادارہ]

جناب شبیر احمد میواتی کی خواہش کے احترام میں آپ کے مؤقر جریدہ "النخیل" (کراچی) کے "مطالعہ نمبر" کے لیے اپنی علمی اور قلمی معروضات کا آغاز میر کے اس شعر سے کرتا ہوں:

میر جمع ہیں احباب، حالِ دل کہہ لے　　پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

راقم الحروف کے اباؤ اجداد تقسیم ہند کے بعد پھرتے پھراتے ضلع سیالکوٹ کے ایک دیہات "گھڑتل" میں آ ٹھہرے، یہیں ۵ جنوری ۱۹۶۳ء کو دنیا میں آنا مقدر ہوا، ہے تو یہ گاؤں ہی لیکن بعض خصوصیات کی وجہ سے اس کو قصبہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، یہ ذکر اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک

تو یہاں میوات کے حضرت جی مولانا ہارون صاحب قدم رنجا فرما ہوئے، نیز میرا تہذیبی اور علمی سرمایہ (یہ جو بھی ہے) کا اس سے گہرا تعلق ہے، یہ قصبہ وطن عزیز کی نہر" اپر چناب" کے مغرب میں واقع ہے، اس کا پُستہ سطح زمین سے خاصا اونچا ہے، گویا یہ ایک ٹیلا ہے یا ٹیلے پر واقع ہے۔ یہاں کے باغات، خاص طور پر رام باغ، تالاب (باؤڑی) درجنوں کنوئیں جو اَب بند ہو چکے ہیں، مندر اور حکومتی ادارے، بچوں اور بچیوں کے پرائمری اسکول، لڑکوں کا ہائی سکول، میڈیکل ڈسپنسری، ویٹرنری ہسپتال (اب نہیں ہے)، ڈاک خانہ، تار گھر (اب نہیں ہے) دس کلومیٹر دور ریلوے اسٹیشن اور ہندو تہذیب کے دیگر آثار اس بات کے شاہد رہے ہیں کہ یہاں اپنے عہد کے مؤثر سیاسی رہنما، ہندو دیوان اور ٹھاکر آباد تھے لیکن اس کے باوجود یہ امر خوش آئند ہے کہ قصبہ کے مختلف محلوں میں چھ مساجد بھی قائم ہیں، جامع مسجد جنوب میں واقع ہے، علاوہ ازیں یہاں تین خانقاہیں بھی تھیں، جن پر چادریں چڑھی رہتیں، جمعرات کو چراغ جلائے جاتے اور گرمیوں (جون، جولائی) میں سہ روزہ میلے منعقد ہوتے تھے۔ مقامی مسلمان، ہندو ساہوکاروں اور زمینداروں کو اب تک یاد کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہندو مسلمان مل جل کر رہتے ہوں گے لیکن اس قصبہ کی خاص بات جو میں اپنے قارئین سے شیئر کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اگرچہ یہاں مسلمانوں کے سب ہی فِرق آباد ہیں اور آس پاس کے دیہاتوں میں بھی یہ مسلکی اختلاف نمایاں رہا ہے لیکن اس سب کے باوجود اس قصبہ کے سب مسلمان جمعہ اور عیدین ہمیشہ سے ایک ساتھ پڑھتے ہیں، ایک جامع مسجد، ایک مدرسہ اور ایک ہی عید گاہ، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی عمدہ اور نادر مثال ہے، جس پر گاؤں کے لوگ بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔

میری بسم اللہ اسی جامع مسجد میں ہوئی، حافظ غلام نبی قریشی اور حافظ حسن خان میواتی میرے ناظرہ کے استاد تھے، مدرسے کی روایتی دینی تعلیم حاصل نہ کر سکا کیونکہ والدِ محترم مجھے عصری اداروں میں پڑھوانا چاہتے تھے، جبکہ دادا جان چونکہ سید حسین احمد مدنی کے ارادت مند اور مرید تھے اور سید سلیمان ندوی سے بھی عقیدت رکھتے تھے، اس لیے غالباً وہ مجھے حافظ اور عالم بنانا چاہتے تھے۔ رائے کا یہ اختلاف تقسیم ہند سے قبل ہی اس وقت نمایاں ہو گیا جب دادا مرحوم نے خاندان سے الگ

سیاسی راہ اختیار کی اور مسلم لیگ کی بجائے جمعیت العلماء ہند کی حمایت کا اعلان کر دیا، البتہ ایک فکر قبیلہ بھر میں مشترک تھی، وہ مولانا الیاس کاندھلویؒ سے عقیدت اور تبلیغ کی محنت سے محبت تھی، یہ ہم میواتیوں کا دینی اور تحریکی ورثہ بھی ہے، جس پر یہ سادہ لوح قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے لیکن اب تو صورتِ حال بقول اقبال کچھ یوں ہے:

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی　　کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارہ

فاضل مدیر"ابن الحسن عباسی" کے سوال نامے سے ایک بات رہی جاتی ہے کہ کتاب بینی کا آغاز کیسے ہوا؟ حُسنِ اتفاق ہے کہ راقم نے اپنے گھر میں افسانوی اردو ادب اور دینی و اسلامی ادب کو ساتھ ساتھ پایا۔ ابا جان فارغ اوقات میں ایک بوسیدہ ضخیم کتاب پڑھتے تھے، جس کے ابتدائی صفحات غائب تھے، یہ دیو مالائی، جنوں، پریوں، شہزادوں اور شہزادیوں کی کوئی کتھا تھی، آپ اسے اُس زمانے کا فکشن (Fiction) کہہ سکتے ہیں۔ میں اس کتاب کو چوری چھپے پڑھا کرتا، ایک دن رنگے ہاتھوں پکڑا گیا، گویا یہ کوئی بُری چیز تھی، اس کے بعد کتاب ہمیشہ کے لیے غائب ہوگئی، تاہم میری ادبی حِس کا ادراک کرتے ہوئے ابا جان نے اس کی تسکین کا سامان یوں کیا کہ نسیم حجازی کے تاریخی ناول پڑھنا شروع کیے، میری عادت تھی کہ اُن کی غیر موجودگی میں اُن کے کمرے کا جائزہ لیتا، ایک دن ان کے سرہانے، عینک کے نیچے ایک کتاب نظر آئی، یہ نسیم حجازی کا ناول "داستانِ مجاہد" تھا، ابا جان بڑی سرعت سے مطالعہ کرتے تھے، بعض دفعہ ہفتہ بھر میں دو دو ناول پڑھ جاتے تھے، اس لیے میرے لیے ضروری تھا کہ میں وہ کتاب ان سے پہلے مکمل کرلوں، یوں ایک ایک کر کے نسیم حجازی کے تمام ناول پڑھ دیئے، مطالعہ کی ایک چیز اور بھی تھی گھر میں، وہ ایک رسالہ تھا جہازی سائز کا، جس پر "خدام الدین" لکھا ہوتا تھا، یہ معلوم نہ ہوسکا کہ انجمن خدام دین کا ماہنامہ ہمارے گھر میں کیسے آیا؟

دادا جان تبلیغ کی محنت سے تو مانوس تھے ہی، چار ماہ کے تبلیغی سفر سے واپس آئے تو تبلیغی نصاب (فضائل اعمال) ہمراہ لائے۔ گھر میں اور پھر عشاء کے بعد مسجد میں تعلیم اب روزانہ کا معمول بن چکا تھا، جس سے کتاب کی اکثر احادیث یاد ہوگئیں۔ خاص طور پر فضائل نماز اور فضائل رمضان کی

حدیثیں، آہستہ آہستہ بات بیان اور تقریر تک جا پہنچی، مطالعہ و بیان کی یہ مشق اُس وقت بہت کام آئی، جب مجھے چالیس دن کے لیے جماعت کے ساتھ ارسال کر دیا گیا۔ اب روزانہ کے بیان اور اعمال ناگزیر تھے اور ان کے لیے ہلکا پھلکا مطالعہ بھی، خدا بھلا کرے، بھلے دن تھے:

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت، دن رات
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

آپ کو یاد ہوگا صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں یومِ آزادی ۱۴ اگست سرکاری طور پر منایا جانے لگا، صدر ضیاء اکابر علماء دیوبند سے عقیدت رکھتے تھے، اُن کے عہدِ حکومت میں لاہور کے چوراہوں میں علامہ شبیر احمد عثمانی کے بڑے بڑے پوٹریٹ نصب کر دیئے گئے تھے، یہ تحریک تعلیمی اداروں کے ذریعے عوام تک پھیل گئی، خوب یاد ہے، کیپٹن محمد حسین میواتی کی قیادت میں گاؤں بھر میں جلوس نکالا جاتا تھا، جس کے اختتام پر تحریکِ آزادی، دوقومی نظریہ اور اکابرین تحریکِ پاکستان پر تقریریں ہوتی تھیں۔ ایسی ہی ایک تقریب کے بعد راقم کو مولوی محمد اسحاق میواتی نے کہا کہ "تم کیا دوقومی نظریہ، قائداعظم اور علامہ اقبال کی باتیں کرتے ہو؟ تمہارے دادا تو حسین احمد مدنی کے مرید اور کانگریس کے حامی تھے"، مولوی صاحب کا اندازِ تخاطب ایک نظر نہ بھایا۔ حضرت مدنی، مولانا آزاد اور گاندھی جی کے سیاسی نظریات سے بھی نابلد تھا، خاندان میں بھی دینی و سیاسی مسلک کے بارے بات نہ ہوتی تھی، اس واقعہ نے میرے اندر ایک کُرید، کھوج اور تحقیق کی فضا پیدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اب میں علماء کے بیانات اور تقاریر کو غور سے سنتا، جو بھی رسالہ یا کتاب ملتی اس میں اپنے سوالات کا جواب تلاش کرتا، نصابی کتب میں بھی علماء دیوبند کی خدمات کے بارے کچھ مثبت اشارے نہ ملتے تھے، اسی دوران ایک دن مولانا محمد یوسف (رفیق مولانا طارق جمیل) اور مولانا سرفراز خان صفدر کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خان بشیر صاحب گھر تشریف لائے، انہوں نے مجھے نقش حیات، کاروانِ احرار، علماء ہند کا شاندار ماضی، اسیر مالٹا، مدنی اقبال نمبر اور "تاریخ دارالعلوم دیوبند نمبر" کا مطالعہ تجویز کیا۔ بہت بھاری نسخہ اس وقت صرف دارالعلوم دیوبند نمبر

حاصل کر سکا، یہ ماہنامہ ”الرشید“ ساہیوال کی خصوصی اشاعت تھی، جس کا ماخذ سید محبوب رضوی کی کتاب تاریخ دارالعلوم دیوبند تھی، یہ پہلی کتاب تھی جو راقم نے دارالعلوم دیوبند کی خدمات کے بارے میں پڑھی۔

میں نے ابتدا میں جو مذہبی رواداری اور مسلکی ہم آہنگی کی بات کی تھی، اس کا صلہ یہاں (گھڑتل) کے علما اور خطبا کو جاتا ہے، مولانا جمال الدین صاحب فاضل دیوبند صبح درسِ قرآن اور جمعۃ المبارک کے علاوہ عیدین کے خطبات ارشاد فرماتے تھے، اپنی تیس سال تدریس میں انہوں نے کبھی مسلک اور فرقہ کی بات نہیں کی، نہ ہی کبھی تنخواہ یا وظیفہ کی خواہش کی۔ ہائی اسکول میں دینیات کے استاد تھے اور حکمت بھی کیا کرتے تھے، قرآن فہمی کی تحریک مولانا موصوف سے ہی ہوئی۔

مولانا مسعودالرحمٰن بالاکوٹ یا مانسہرہ سے تعلق رکھتے تھے، ہمارے یہاں خطیب ہوئے پھر یہیں کے ہو رہے، قرآن کا بہت گہرا مطالعہ رکھتے تھے، ہم عصر علما سے رابطے میں رہتے، ماہنامہ ”بینات“ کا تعارف مجھے انہی سے ملا اور ”بینات“ وہ رسالہ ہے، جس میں میرا اولین مضمون ”اسلام کی تعلیم اعتدال“ (شمارہ: ۱۲، جون ۱۹۹۲ء) شائع ہوا، پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور محترم مفتی سعید جلال پوری کی وفات تک جاری رہا۔ بینات کے بعد ”الخیر“، ملتان، ”الحق“، اکوڑہ خٹک، ”الحسن“، لاہور، ”القاسم“، نوشہرہ، ”ضیائے حرم“، بھیرہ اور ”الشریعہ“، گوجرانوالہ میں بیسیوں مضامین شائع ہوئے۔ جناب مجید نظامی صاحب اور مجیب الرحمن شامی نے بھی ”نوائے وقت“ اور ”پاکستان“ میں کچھ آرٹیکل نکالے، جس سے میرا حوصلہ بڑھا اور میرے اعتماد میں اضافہ ہوا۔ اس دوران دیگر متعدد رسائل و جرائد کا مطالعہ جاری رہا جن میں ”دارالعلوم“، دیوبند، ”معارف“، اعظم گڑھ، ”فکر و نظر“، اسلام آباد، ”محدث“، لاہور ”الفاروق“، کراچی، ”البلاغ“، کراچی اور جماعت اسلامی کا ”ترجمان القرآن“، لاہور قابلِ ذکر ہیں۔ ہفت روزہ ”تکبیر“، ”زندگی“، ”چٹان“، ”الاعتصام“، ”اہلحدیث“، ”ختم نبوت“ بھی زیرِ مطالعہ رہے، خاص طور پر ”تکبیر“ نے بہت متاثر کیا۔

جنوری ۱۹۸۸ء میں لیکچرار اسلامیات ہوا تو مطالعہ کا ایک نیا دور شروع ہوا، ۱۹۹۹ / ۲۰۰۰ء میں

"علامہ اقبال اور مولانا اشرف علی تھانوی افکار کا تقابلی جائزہ" کے عنوان سے ایم فل کی ڈگری کے لیے مقالہ تحریر کیا، اس دوران مطالعہ اور تجزیہ کے نئے تجربات سے سرشار ہوا، برصغیر پاک و ہند میں یہ پہلا کام ہے جو حضرت تھانوی اور علامہ اقبال کی فکری مماثلتوں اور علمی اختلاف پر کیا گیا ہے۔ اس مقالہ کے نگران پروفیسر ڈاکٹر طفیل ہاشمی صاحب تھے۔ یہ ڈاکٹر ہاشمی ہی ہیں جنہوں نے مجھے تحقیق کی خارزار وادی میں دھکیل دیا، یہ مقالہ ۲۰۰۰ء میں پنجاب بھر کی جامعات میں ایم فل اقبالیات کے لیے لکھے جانے والے مقالات میں اول انعام کا حق دار قرار پایا۔ اسی تحقیق سے متعلق ایک مضمون "علامہ اقبال اور مولانا اشرف علی تھانوی: فکری مماثلتیں" ماہنامہ الشریعہ (شمارہ: ۰۵، مئی ۲۰۰۲ء) نے شائع کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اس مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا زاہد الراشدی کو مکتوب لکھا جس میں راقم الحروف کو مبارکباد دیتے ہوئے حوصلہ افزائی فرمائی، غالباً اسی مکتوب کے بعد راقم ماہنامہ کی مجلسِ تحریر میں شامل کیا گیا۔ یہ تفصیل اس لیے بیان کی گئی کہ یہی وہ حالات تھے جن سے راقم الحروف نے تحریک لی اور اپنے مطالعہ کو آگے بڑھانے کی سعی کی۔ آپ جانتے ہیں کہ علم و ادب ایک ایسا سمندر ہے، جس کا دوسرا کنارہ نہیں ہوتا، بقول منیر نیازی:

ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا

اب سوچا کے مطالعہ کو پی ایچ ڈی کے حوالے سے آگے بڑھایا جائے، یوں اہلِ علم سے رابطہ اور رہنمائی ملتی رہے گی، موضوع اور خاکہ کی تیاری میں پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر صاحب سابق ڈین شعبہ علومِ اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور نے معاونت فرمائی۔ "مولانا محمد قاسم نانوتوی کی حفاظتِ دین میں خدمات" پر کام کرنا طے پایا۔ آخرکار "مکالمہ بین المذاہب میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کا اسلوب" کے عنوان سے پروفیسر ڈاکٹر سعد صدیقی صاحب کی رہنمائی میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ کام مکمل ہوا، تاہم حصولِ ڈگری کے مراحل طے کرنا ابھی باقی ہیں۔

ان مقالات کی تیاری میں جو کتب زیرِ مطالعہ رہیں، وہ ہی میری پسندیدہ ہیں، ان سب کا تذکرہ تو

کسی طرح ممکن نہیں چنانچہ چند ایک کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔علامہ شبیر احمد عثمانی کی ”تفسیر عثمانی“ کو بہت متوازن پایا، روایت و درایت کے علاوہ قدیم وجدید علمی وسائنسی نظریات کو ساتھ بیان کیا گیا ہے۔فقہی مسائل کے لیے مفتی محمد شفیع کی ”معارف القرآن“ سے استفادہ ناگزیر رہا، کلامی مباحث کے لیے تفسیر حقانی، بیان القرآن کے علاوہ معارف القرآن (مولانا محمد ادریس کاندھلوی) نے متاثر کیا۔

تفہیم حدیث کے لیے انوار الباری، فضل الباری اور ترجمان السنہ کو بہت مفید پایا، سیرت نبوی پر ایک بڑا علمی ذخیرہ موجود ہے لیکن سید سلیمان ندوی/مولانا شبلی نعمانی کی سیرت النبی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی سیرت مصطفی، قاضی منصور پوری کی رحمۃ اللعالمین، مولانا ابراہیم سیالکوٹی کی سیرت مصطفی، حکیم محمود ظفر کی پیغمبر امن، مناظر احسن گیلانی کی النبی خاتم، نعیم صدیقی کی محسن انسانیت، پیر کرم شاہ الازہری کی ضیاء النبی اور سید امیر علی کی روح اسلام بہت عمدہ کتب نظر آتی ہیں۔اس باب میں محمد حسین ہیکل کی حیات محمد، حضرت عمر فاروق اور شبلی کی الفاروق بھی ناقابلِ فراموش علمی وادبی فن پارے ہیں۔شاہ ولی اللہ کی جملہ کتب بے مثال ہے لیکن خاص طور پر ”حجۃ اللہ البالغۃ“ کلام حکمت کی بہت بڑی کتاب ہے، اس ضمن میں امام غزالی، امام رازی کے علاوہ علامہ شبلی کے علم الکلام اور الکلام کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔سید ابوالحسن علی ندوی صاحبِ اسلوب مصنف اور ادیب ہیں، ان کی تاریخ دعوت وعزیمت اور شیخ اکرام صاحب کی رودکوثر اور موج کوثر بہت مفید کتب ہیں۔

حضرت مدنی کی نقش حیات، اسیر مالٹا اور تحریکات پر مولانا غلام رسول مہر اور ابو سلمان شاہجہانپوری کی تصنیفات بھی زیرِ مطالعہ رہتی ہیں، تصوف میں مکتوباتِ امام ربانی، مولانا تھانوی کی شریعت وطریقت، التکشف (عرفانِ حافظ)، کلیدِ مثنوی کے علاوہ خطباتِ حکیم الامت، الافاضات الیومیہ سے بھرپور استفادہ کا موقع ملا۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی کی حجۃ الاسلام، انتصار الاسلام، قبلہ نما، تقریر دلپذیر، تحذیر الناس، فوائد قاسمیہ کے علاوہ آپ کے فکر وفن پر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند، نئی دلی کے خصوصی نمبرات،

مولانا نانوتوی کا سوانحی ادب، سوانح قاسمی (مناظر احسن گیلانی)، انوار قاسمی (انوار الحسن شیر کوٹی)، "مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات وکارنامے" (اسیر ادروی)، علاوہ ازیں علامہ محمد اقبال کی نظم (مثنوی)، اسرار ورموز اور نثر میں "تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ"، بہت پسند آئیں۔ دیوبندی علم الکلام میں اس کے ٹکر کی کوئی چیز ہے تو وہ مولانا نانوتوی کے مکتوبات "قاسم العلوم" ہیں۔ جس کی اردو شرح "انوار النجوم" (مولانا شیر کوٹی) نے اس کو مزید سہل اور مفید بنا دیا ہے۔

شعراء میں غالب اور اقبال ہی نے متاثر کیا، دار العلوم دیوبند کے شعری ادب میں مولانا ناز کی کیفی کا مجموعہ کلام "کیفیات" بھی زیرِ مطالعہ رہتا ہے، مولانا تھانوی نے بھی ایک سفر نامہ لکھا تھا لیکن جدید اردو ادب میں مولانا تقی عثمانی کے سفر نامے زیادہ مفید نظر آتے ہیں۔

اب رہی بات مطالعہ کے اوقات وغیرہ کی تو اس میں راقم کا تجربہ تو یہ ہے کہ نمازِ فجر سے دوپہر ۱۲ بجے تک کا وقت دیرپا مطالعہ کے لیے بہت مفید ثابت ہوتا ہے، خاص طور پر تصنیف وتالیف کے لیے یہ اوقات بہت مبارک ثابت ہوئے۔ سہ پہر یا رات کا لکھا ہوا صبح اٹھ کر پڑھا تو ایک بڑے حصہ کا اعادہ ضروری معلوم ہوا، رات کے سناٹے میں مطالعہ ایک پر کیف اور لطف انگیز چیز ضرور ہے لیکن کیف وسرور کوئی مستقل چیز تو نہیں۔ دورِ حاضر میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے مضر اثرات میں ایک یہ بھی ہے کہ اس نے کتاب کا لمس اور حظ کا مزہ ختم کر دیا ہے۔ کتاب کو پڑھنا اور بات ہے اور اس کو چُھونا اور بات ہے۔ پھر دو مسوں کا اپنا اپنا مزہ ہے۔ مجھے یاد ہے جب "بینات" موصول ہوتا تو پہلے میں اسے سونگتا تھا، اس کے کاغذ اور تحریر کی خوشبو کبھی فراموش نہیں کر سکتا، اب آپ بتایئے یوٹیوب/آن لائن پر یہ ممکن ہے؟ اس سے تو مطالعہ کی کی حرمت ہی اٹھ جاتی ہے۔

ہم کیوں پڑھتے ہیں اور کیوں لکھتے ہیں؟ اگر ڈگریاں، تحقیقی الاؤنس یا کوئی اور مالی منفعت ہی پیشِ نظر ہے تو پھر مشورہ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہماری عصری جامعات میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ مقصد تلاش حق اور تحقیق تو ہے نہیں، مطالعہ کی سمت متعین کرنے میں اہم بات مقصد اور قاری کا اپنا ذوق ہی ہوتا ہے، ہاں اس کے حصول اور تسکین کے لیے اہلِ علم سے مشورہ اور رہنمائی ناگزیر ہوتی ہے، یوں

بعض اوقات تحقیق و تجزیہ کے ایسے در وا ہوتے ہیں جو عام حالات میں ہمارے پیشِ نظر نہیں ہوتے، اکبر الہ آبادی نے درست فرمایا تھا:

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں آدمی، آدمی بناتے ہیں

امید کی جانی چاہیے کہ حضرت مولانا ابن الحسن عباسی کی یہ علمی کاوش بہت مفید ثابت ہوگی، اس سے برصغیر پاک و ہند کے اہلِ علم رابطے میں ہوں گے، تحقیق و تجزیہ کے نئے زاویے اور اسلوب سامنے آئیں گے اور کام کرنے والے اصحاب کے لیے حوالے اور آسانیاں پیدا ہوں گیں، خاص طور پر ماہنامہ "النخیل" کے لیے قلمی تعاون میں اضافہ ہوگا۔

اس نوع کی ایک مثال قبل ازیں موجود ہے، مولانا سمیع الحق مرحوم نے بھی ایک سوالنامہ تصنیف کیا تھا، جو ۸ نِکات پر مشتمل تھا، جوابات بعد ازاں "میری علمی اور مطالعاتی زندگی" (مرتبہ مولانا عبدالقیوم حقانی) کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کتاب میں اکیس علما اور ممتاز سکالرز کے حالات مرتب کیے گئے ہیں۔ "مطالعہ نمبر" میں تو اس سے کہیں زائد اہل علم کا تذکرہ سمٹ آئے گا، جو یقیناً ایک قومی و ملی دستاویز ثابت ہوگی۔

دراصل اپنے بارے کچھ بھی لکھنا بہت ہی نازک اور مشکل امر ہے، جس میں لفظ لفظ پر خودستائی اور خودنمائی کا شائبہ موجود ہوتا ہے، "میں"، "میری"، "میرے"، "ہم" اور "ہمارے" جیسے الفاظ کا استعمال ہی احتیاط کا تقاضا کرتے ہیں، گویا: "لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام" نیز یہ جانتے ہوئے بھی کہ "نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی"

اب اسے سینہ میں مزید تھامے رکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ تعمیل تو بہر حال کرنا ہی تھی۔

والسلام

۱۲/ ۰۵/ ۲۰۲۰

☆......☆......☆

تعلیم وتربیت

خبر لیجے زباں بگڑی

ڈاکٹر تحسین فراقی

[ڈاکٹر تحسین فراقی (پ: ۱۷ستمبر ۱۹۵۰ء) اردو، فارسی اور عربی کے ممتاز نقاد، شاعراور محقق ہیں۔ آپ طویل عرصہ جامعہ پنجاب اورینٹل کالج کے شعبہ اردو کے صدر، بعدازاں اردو" دائرہ معارفِ اسلامیہ" کے پروفیسر رہے۔ آپ ۱۸مارچ ۲۰۱۳ء سے ۲۲فروری ۲۰۲۱ء تک مجلس ترقی ادب جیسے معتبر علمی ادارے کے ناظم رہے۔ آپ ۴۱ تحقیقی کتابوں کے مصنف ومرتب ہیں، جن میں "عبدالماجد دریا بادی-احوال وآثار"، "جستجو"، "معاصر اردو ادب"، "جہاتِ اقبال"، "غالب فکر آہنگ" وغیرہ معروف ہیں۔ آپ "النخیل" کی مجلسِ ادارت کے رکن ہیں، ان شاء اللہ آپ کی تحریریں النخیل کی زینت بنتی رہیں گی۔ ادارہ]

کسی ظریف نے برسوں پہلے کہا تھا کہ اگر یوپی والے اپنی صحت کی بھی اتنی ہی فکر کرتے جتنی صحتِ زبان کی اور اہلِ پاکستان (خصوصاً اہلِ پنجاب) اپنی صحتِ زبان کی بھی اتنی ہی فکر کرتے جتنی اپنی صحت کی کرتے ہیں تو دونو کا بھلا ہوتا۔ یوپی کا حال تو خیر اب معلوم نہیں، ہاں اپنی سرزمین میں ایک عرصے سے صحت کا معاملہ بھی تلپٹ ہے اور صحتِ زبان کا اس سے بھی زیادہ تلپٹ اور عالم یہ ہو گیا ہے کہ: خط غلط، اِملا غلط، انشا غلط! اپنے پچھلے کالم میں "نہ صرف" کو "نا صرف" چھپا ہوا دیکھ کر سر پیٹ لینے کو جی چاہا۔ معلوم ہوا کہ کمپوزر صاحب نے "نہ" کو "نا" کر کے میری اصلاح فرمائی ہے اور اپنی نافہمی کا ثبوت دیا ہے اور معاملہ اب "نہ" اور "نا" تک محدود نہیں رہا، ذرائع ابلاغ جن میں بدقسمتی سے اردو اخبارات بھی شامل ہیں، بڑی بے نیازی سے دانستہ یا نادانستہ اردو کا حلیہ بگاڑنے میں سرگرم ہیں اور

کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں۔ ان میں سے بہت سوں کو احساس تک نہیں کہ قومی زبان کا بگاڑ جانے بوجھے ہو یا بے جانے بوجھے، دراصل قومی تشخص کے بگاڑ کے مترادف ہے۔ بڑی مشکل یہ ہو گئی ہے کہ نئی نسل کا بیشتر دارومدار انھی ذرائع ابلاغ میں منحصر ہو کر رہ گیا ہے، لہٰذا ان کی زبان، روزمرہ، محاورہ اور مکالمہ تیزی سے بگڑ رہا ہے اور یوں ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر بعض دیگر ممتاز زبان دانوں کی طرح ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے بھی صحتِ زبان کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس موضوع پر ایک بہت مفید کتاب تالیف کی ہے جس کا نام ہی "صحتِ زباں" ہے (ناشر: ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد) مگر اس سے پہلے کہ میں اس کتاب کی خوبیوں سے آپ کو آگاہ کروں، پہلے اسی کتاب میں شامل ایک دلچسپ لطیفہ آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں جس سے اندازہ ہو گا کہ ہمارے بزرگ صحتِ زبان کے معاملے میں کس قدر حساس تھے۔

ایک زمانہ تھا (اور یہ زمانہ بہت حد تک خود میرا دیکھا ہوا ہے) جب ریڈیو اور ٹی وی پر درست تلفظ کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ ریڈیو پر ایسے ماہرینِ زبان کا تقرر کیا جاتا تھا جو صداکاروں اور فیچر اور خبریں پڑھنے والوں کا تلفظ درست کرتے تھے۔ ایک بار زیڈ اے بخاری نے ریڈیو پر ایک تقریر ریکارڈ کرائی اور نشر ہونے سے پہلے اسے سنا تو انھیں احساس ہوا کہ ایک لفظ کا تلفظ وہ غلط کر گئے ہیں، چنانچہ بحیثیت افسرِ اعلیٰ انھوں نے حکم دیا کہ تقریر دوبارہ ریکارڈ کی جائے۔ ایک ماتحت نے کہا: حضور چھوڑیے، لاکھوں میں کوئی ایک آدمی ہو گا جو اس لفظ کے صحیح تلفظ سے واقف ہو گا۔ بخاری بولے: ارے، اسی ایک کم بخت کے لیے تو اِسے دوبارہ ریکارڈ کرانا چاہتا ہوں۔ افسوس، اب اس طرح کی حسّاسِیّت ماضی کا قصہ ہو کر رہ گئی ہے۔ کیا زمانہ تھا جب اخلاق احمد دہلوی، مولانا حامد علی خاں اور متعدد نامور زبان دان ذرائع ابلاغ کا سرمایہ تھے اور ان کے دم سے معیاری اردو ہوا کے دوش پر پرّاں ہو کر کانوں میں رس گھولتی اور دلوں میں جوت جگاتی تھی۔ لوگ ریڈیو سن کر اپنا تلفظ درست کرتے تھے۔

رؤف پاریکھ صاحب نے اپنی قابلِ قدر کتاب "صحتِ زباں" میں ان متعدد الفاظ، تراکیب اور محاورات کی نشاندہی کی ہے جنھیں پاکستان کے ذرائع ابلاغ نے ایک عرصے سے تختۂ مشق بنا رکھا

ہے۔ڈاکٹر صاحب نے قوی دلائل دے کر ان الفاظ وتراکیب کی صحیح وضعوں کو اجاگر کیا ہے۔موصوف لسانیات کے ماہر ہیں اور الفاظ وتراکیب کے اسرار ورموز سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔اس ضمن میں ان کا وسیع لسانی پس منظر کتاب کے ورق ورق پر ان کے کام آیا ہے۔ یہاں بعض ان اغلاط کی نشاندہی بے محل نہ ہوگی جو ذرائع ابلاغ سے کثرت اور تواتر کے ساتھ سرزد ہو رہی ہیں۔ساتھ ہی ساتھ ان اغلاط کی تصحیح کو بھی نشان زد کر دیا ہے۔غلط جملے اور ان کی درستی ملاحظہ کیجیے:

۱......"میں نے استفادہ حاصل کیا"۔ میں نے استفادہ کیا ("استفادہ" میں حاصل کا مفہوم موجود ہے،لہٰذا استفادہ کے ساتھ حاصل لکھنا غلط اور بے معنی ہے)۔

۲......"طیارے کے حادثے کی رپورٹ اَفشاں کر دی جائے گی"۔اس جملے میں "اَفشاں" نہیں، "اِفشا" کا محلّ ہے۔"افشا" چھُپی ہوئی چیز کے ظاہر کرنے کو کہتے ہیں جبکہ "افشاں" وہ سنہرا برادہ ہے جو خواتین سنگھار کے طور پر مانگ میں چھڑکتی ہیں۔

۳......"اِنشاءَ اللہ میں آؤں گا"۔ انشاء اللہ کو ملا کر لکھنا درست نہیں، اسے "اِن شاءَ اللہ" (یعنی اگر اللہ نے چاہا) لکھنا چاہیے کیونکہ عربی میں اِن کا معنیٰ "اگر"، شَاءَ کا مطلب "چاہا" ہے۔

۴......"تمام اہلیانِ لاہور سے درخواست ہے"۔۔۔"اہلیان" سے دھیان فوراً "اہلیہ" کی طرف جاتا ہے،سو "اہلیان" بالکل غلط ہے۔صحیح "اہلِ لاہور"، "اہالیِ لاہور" یا "اہالیانِ لاہور" ہے۔ظاہر ہے کہ اہل کے سابقے کے ساتھ کتنی ہی تراکیب بنتی ہیں جیسے اہلِ وطن، اہلِ زباں، اہلِ قلم، اہلِ خانہ، اہلِ کتاب۔ان سب تراکیب میں "اہل" واحد ہونے کے باوجود جمع کا مفہوم دے رہا ہے،لہٰذا اہالی/اہالیان کی نسبت یہی زیادہ فصیح بھی ہے اور آسان بھی اور یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ زبان آسانی چاہتی ہے۔

۵......"برائے مہربانی مجھے پانی پلا دیں"۔"برائے مہربانی" کا اس جملے میں بالکل غلط استعمال ہوا ہے، اس لیے کہ "برائے مہربانی" کا مطلب ہے "مہربانی کے لیے"، اور یہ بالکل بے معنی ہے۔صحیح "براہِ مہربانی" یا "از رہِ مہربانی" ہے جس کا لفظی معنی ہے "مہربانی کی راہ سے"، یعنی مہربانی فرما کر، مہربانی کر کے۔

۶......"برِّ صغیر میں کئی قومیں آباد ہیں"۔اس جملے میں "برِّ صغیر" کا استعمال درست نہیں۔"برصغیر" کی جگہ "برعظیم" ہونا چاہیے کیونکہ انگریزی کے "کانٹی نینٹ" کو "براعظم" کہا جاتا ہے۔اعظم کا معنی ہے "سب سے بڑا"۔"اعظم" سے چھوٹا ازروئے لغت اور ازروئے منطق "عظیم" ہوگا نہ کہ "صغیر"۔اب وہ علاقہ جو بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش اور نیپال و بھوٹان جیسے نہایت وسیع رقبے پر مشتمل ہو اتنا چھوٹا کیسے ہوسکتا ہے کہ اسے "برِ صغیر" کے حقیر اور بے مقدار لفظ سے ظاہر کیا جائے۔مگر المیہ یہ ہے کہ اکثر اہلِ قلم "برعظیم" کے بجائے "برصغیر" کی ترکیب برتتے ہیں جو نامناسب بھی ہے اور معنوی اعتبار سے غلط بھی۔واضح رہے کہ "برصغیر" کا مطلب ہے خشکی کا چھوٹا سا ٹکڑا جبکہ مذکورہ ممالک کی جغرافیائی وسعت ایک چھوٹے سے براعظم کے مترادف ہے۔

کیا ہم "برعظیم" کو ایک مدت سے "برصغیر" کہہ اور لکھ کر کہیں اپنے احساسِ کمتری کا اظہار تو نہیں کر رہے؟ ایسا احساسِ کمتری جو ہمارے لاشعور کی گہرائی میں چھپا ہوا ہو؟

۷......"چشم زدن کی ترکیب کی بھی ان دنوں شامت آئی ہوئی ہے"۔شامت اس لیے کہ اخبار نویس اور ٹی وی کے میزبان اسے "چشمِ زدن" لکھنے اور بولنے لگے ہیں۔"چشم" کی میم کے نیچے "زیر" لگانا غلط ہے کیونکہ "چشمِ زدن" کا معنی ہوگا "زدن (مارنے) کی آنکھ" اور یہ ایک بے معنی ترکیب ہے۔"چشم زدن" کا معنی ہے آنکھ جھپکتے ہی، فوراً، ایک لمحے میں، پلک جھپکتے ہی، بہت تیزی سے۔ لہٰذا چشم کی میم پر اضافت لگانا بے معنی ہے۔

۸......"ہامی" اور "حامی" دو الگ الگ لفظ ہیں۔"حامی" عربی کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں "حمایت کرنے والا"، جبکہ "ہامی" اردو کا لفظ ہے اور اس کا معنی ہے "ہاں کہنے کا عمل" جیسے، اس نے فلاں کام کی ہامی بھر لی۔اگر جملے میں یوں لکھا جائے کہ: اس نے فلاں کام کی حامی بھر لی تو یہ غلط ہوگا۔

ڈاکٹر پاریکھ صاحب نے بڑی تلاش اور کاوش سے "صحتِ زباں" میں دو سو بتیس الفاظ، محاورات اور تراکیب درج کی ہیں جنھیں ہمارے ذرائع ابلاغ کے بزرجمہر، اخبار نویس اور 'کاتا اور لے دوڑی' پر عامل بعض نام نہاد ادیب غلط لکھتے بولتے ہیں۔کیا ستم ہے کہ یہ لوگ بے دھڑک حیرانی کو "حیرانگی"،

خود کُش کو خود کَش، اِز دِحام کو اژدہام، اِنکسار کو انکساری، تابع کو تابعدار، خط کتابت کو خط و کتابت، برخاست کو برخواست، فریقین کو دونوں فریقین، مُتَرْجِم کو مُرَجّم، کان کَن کو کان کُن اور ہراسانی کو ہراسگی لکھتے بولتے ہیں اور ایک لمحے کو پریشان اور پشیمان نہیں ہوتے۔

پاریکھ صاحب نے پیشِ نظر کتاب تالیف کر کے نہ صرف ایک بڑی علمی ضرورت کو پورا کیا ہے بلکہ کتاب کے اسلوب کو بھی جا بجا اپنی خوش مزاجی سے ہرا بھرا رکھا ہے اور یوں بظاہر موضوع کی خشک زمین میں مِزاح اور لطافت کے خوش رنگ پھول کھلائے ہیں۔ ذرا آپ بھی کچھ جملوں سے اپنے مَشامِ جاں کو معطر کر لیں: بس صاحب! اگر آپ آج سے طے کر لیں کہ ہامی کو حامی نہیں لکھیں گے تو گویا آپ نے ہامی بھر لی کہ آپ درست املا کی مہم کے حامی ہیں۔

امید کرنا چاہیے کہ کُشتن اور کَشیدن کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمارے ٹی وی کے میزبان خُود کُش میں کاف پر پیش بولا کریں گے ورنہ ہم کشیدہ خاطر رہیں گے اور یہ کشیدگی اچھی نہیں۔ ہمیں اس نامراد مرض کو رونا کو رونا ہے۔۔ کئی بار حج کرنے والے حاجی صاحبان سے درخواست ہے کہ خود کو الحاج لکھیں بھی تو اسے "جس نے حج کیا ہو" کے معنی میں سمجھیں، نہ کہ "بہت سارے حج کرنے والا" کے مفہوم میں۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تو بقول غالب: حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی!

ہمارے بعض قابل لوگوں نے پانچویں جماعت سے آگے بھی کچھ "فالتو" تعلیم حاصل کر رکھی ہے لہٰذا انھوں نے انگریزوں کو بھی اصلاح دے دی ہے اور "چیئر مین" کی جمع "چیئر مینز" بنا کر ان کی زبان اور لغت میں ایک نئے لفظ کا اضافہ کر دیا ہے۔

حق یہ ہے کہ پاریکھ صاحب کی "صحتِ زباں"، اردو کے مصنفوں، صحافیوں، ریڈیو ٹی وی کے میزبانوں اور علم دوستوں کے لیے ایک ناگزیر دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

☆......☆......☆

علم و تحقیق

غیر مسلم شعرا کی نعت گوئی

ڈاکٹر عمیر منظر

ممتاز شاعر ڈاکٹر عمیر منظر ۲۰۱۲ ء سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی (لکھنؤ کیمپس) میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں، اس سے قبل آپ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں تدریسی خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ آپ ماہنامہ "کتاب نما"، دہلی کے اعزازی مدیر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں "راجیند رمنچندہ بانی"، "باتیں سخن کی"، "شبلی۔ مکاتیب شبلی اور ندوۃ العلما"، "رشید حسن خان" وغیرہ مشہور ہیں۔ النخیل کے لیے بھیجی گئی آپ کی تحریر پیشِ خدمت ہے۔ ان شاء اللہ آپ کی تحریریں النخیل کی زینت بنتی رہیں گی۔ ادارہ]

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت اور سیرت انسانوں کو متاثر کرتی ہے اور اسی کا فیضان ہے کہ آپ کے بارے میں کیا مسلمان اور کیا غیر مسلم سب عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ چونکہ تخلیق کار زیادہ حساس ہوتا ہے تو اس کا متاثر ہونا یا اس کی رغبت کا ہونا ایک فطری بات ہے۔ اردو کی دیگر شعری اصناف کی طرح نعتیہ شاعری غیر مسلم شعرا کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔

غیر مسلم شعرا کی نعت گوئی کا سلسلہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ سے ہی شروع ہوجاتا ہے۔ اعشی میمون بن قیس جو کہ زمانہ جاہلیت کا مشہور شاعر تھا۔ سوق عکاظ میں جس کے قصائد کی دھوم تھی نیز **سبعہ معلقہ** کے ایک شاعر کے طور پر بھی جانا جاتا ہے جن کے قصائد خانہ کعبہ کی دیواروں پر آویزاں کیے جاتے تھے، اس نے بھی نعت کہی تھی۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ وہ نعتیہ اشعار کہہ کر حضور اقدس کی خدمت میں جارہا تھا کہ مسلمان ہوجائے مگر اہل عرب نے کسی طرح اس کو اس ارادے سے باز رکھا۔ فارسی اور اردو شاعری میں غیر مسلم شعرا نعت گوئی کا سلسلہ تاریخی تسلسل کے ساتھ ملتا ہے۔ نعتیہ

ادب کے معروف محقق پروفیسر ریاض مجید لکھتے ہیں کہ جنوبی ہند سے ہی غیر مسلم شعرا کی نعت گوئی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔وہ لکھتے ہیں:

"لچھی نرائن شفیق کا "معراج نامہ" اور راج مکھن لال مکھن کا نعتیہ کلام اس اظہار عقیدت کے نمونے ہیں۔"

(اردو میں نعت گوئی۔ریاض مجید،ص ۵۸۳۔اقبال اکادمی لاہور۔۱۹۹۰)

البتہ پروفیسر ریاض مجید ہندو شاعروں کی نعت کا حقیقی دور ۱۸۵۷ کے بعد کا قرار دیتے ہیں۔ان کا یہ بھی خیال ہے کہ دور جدید میں بہت سے ہندو شعرا ملتے ہیں جنھوں نے نعتیہ شاعری کی روایت کو معیار کے اعتبار سے آگے بڑھایا ہے۔اس ضمن میں انھوں نے منشی شنکر لال ساقی (۱۸۹۰۔۱۹۲۰)، مہاراجہ سرکشن پرشاد، دلورام کوثری اور عرش ملیسانی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

نعتیہ ادب کے ایک اور محقق نور میرٹھی لکھتے ہیں:

"دور متوسطین میں پہلے غیر مسلم شعرا میں منشی شنکر لال ساقی اور راجہ مکھن لال مکھن اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ان دونوں شاعروں نے نعت گوئی میں نمایاں مقام حاصل کیا۔دور جدید کے شعرا میں مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، دلورام کوثری، بال مکند عرش ملسیانی اور دور حاضر کے مشہور شعرا میں امر چند قیس جالندھری، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پیارے لال رونق دہلوی، کالیدارس گپتا رضا، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، اوم پرکاش، ساحر ہوشیار پوری، گرسرن لال ادیب لکھنوی، راجہ بھگوان داس بھگوان، لچھمی نارائن سخا اور دامودر سخی ٹھاکر نے برصغیر کی سطح پر شہرت حاصل کی۔ ان کے علاوہ الن جون مخلص بدایونی پہلے مسیحی شاعر ہیں جن کا ہدیہ عقیدت گلدستہ نعت ۱۹۳۹ میں بدایوں سے شائع ہوا، اور دوسرے مسیحی شاعر نذیر قیصر ہیں جن کا مجموعہ نعت 'اے ہوا موذن ہو' لاہور سے ۱۹۹۲ میں منظر عام پر آیا۔

(بہر زماں بہر زماں صلی اللہ علیہ وسلم، نور میرٹھی، ص ۴۵ کراچی ۱۹۹۲)

چونکہ اردو کا خمیر ہندستان کی سرزمین سے اٹھا ہے اور یہاں کے خمیر میں پیار، محبت، روحانیت اور رواداری شامل ہے۔مسلمانوں کے روحانی نظام کو سرزمین ہند سے اور سرزمین ہند کے روحانی نظام کو مسلمانوں سے کبھی اجنبیت نہیں محسوس ہوئی۔اس باہمی انس و محبت سے ایک عظیم مشترکہ تہذیبی

وراثت بھی وجود میں آئی اور سچ یہ ہے اردو زبان بھی اسی انس ومحبت کا نتیجہ ہے۔

ہندستان سماجی تاریخ پر نگاہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہاں آنے والے صوفیا کی تعلیمات کا مرکز ومحور حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی تھی۔اس لیے جب ان صوفیا نے ہندستانی سماج یا معاشرے کو اپنے کردار واخلاق اور تعلیمات سے متاثر کرنا شروع کیا تو خود بہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات وشخصیت بھی مثالی بنتی گئی۔کرشن بہاری نور لکھنوی نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے:

ایمان اس کو کہتے ہیں اے اہل بندگی!
اک اجنبی کی بات پہ سب کو یقین ہے

نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلم شعرا کی کئی نسلیں سامنے آتی گئیں اور ان شعرا کے کلام کا وقیع ذخیرہ اردو کے نعتیہ ذخیرہ کا حصہ بنتا گیا۔رسول خدا سے عقیدت ومحبت کا ایسا والہانہ اظہار ان کی نعتوں میں ملتا ہے کہ رشک آتا ہے۔کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا ایک شعر تو زبان زد خاص وعام ہے:

عشق ہوجائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمد پہ اجارہ تو نہیں

لیکن ان سے بہت پہلے دلورام کوثری نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں نذرانہ عقیدت پیش کر کے اپنے دلی جذبات واحساسات کو آئینہ کیا تھا۔دلورام کوثری کے دو نعتیہ مقطع ملاحظہ فرمائیں:

لے کے دلورام کو حضرت گئے جنت میں جب
غل ہوا ہندو بھی محبوب خدا کے ساتھ ہے
کچھ عشق پیمبر میں نہیں شرط مسلماں
ہے کوثری ہندو بھی طلب گار محمد

حضور سرور کونین کے تعلق سے اظہار عقیدت کرنا اسلام میں تو بتایا گیا ہے اور اس کی پاس داری کی جاتی ہے کہ جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مدحت کے تعلق سے آپ کو یاد کرے اور حضرت حق کے فرمان کے مطابق لیکن مشترکہ تہذیب کا جو اثر اور جو صورت حال ہے، وہ یہ ہے کہ ہندستان گیر سطح پر غیر مسلموں نے اس کلچر کو اپنایا ہے۔جہاں جہاں وہ ہیں انھوں نے آپ کی شان میں عقیدتوں کا

نذرانہ پیش کیا ہے۔غیر مسلموں میں ہندو، سکھ اور عیسائی مذہب کے ماننے والوں نے اردو کی نعتیہ شاعری میں قابل ذکر اضافہ کیا ہے۔ یہ روایت ابتدا سے جاری ہے اور آج بھی بے شمار شعرا اسلام کے پیروکار نہ ہونے کے باوجود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حضور میں اپنی عقیدتوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔قرآن میں ورفعنالک ذکرک کہا گیا ہے۔اس الوہی اعلان کی دلیل کے طور پر غیر مسلم شعرا کی نعتوں کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

غیر مسلم نعت گو شعرا کی ایک نمایاں خوبی نعتیہ شاعری کی روایتوں اور رسموں کی پاس داری ہے۔غیر مسلم شعرا کی نعت گوئی کے بارے میں ہمارے بعض ناقدین نے لکھا ہے کہ ان کے یہاں روایت کی مکمل پاس داری ملتی ہے، یہاں عرض صرف یہ کرنا ہے کہ الوہیت اور رسالت کا جو فرق ہے ہمارے بہت سے نعت گو شعرا اس کا خاطر خواہ پاس نہیں رکھتے۔اس سے متعلق بہت سے مباحث ہیں، البتہ غیر مسلم شعرا نے اس روایت کو سامنے رکھتے ہوئے جو کچھ پیش کیا ہے، اسے مشترکہ تہذیبی ورثے کے طور پر دیکھنا چاہیے۔غیر مسلم شعرا کے یہاں عقیدت ومحبت اور سرور کائنات سے شیفتگی اپنی جگہ لیکن منصب رسالت کو الوہیت کے درجے پر فائز نہیں کیا جاسکتا۔اس باریک فرق کا لحاظ ضروری ہے۔پنڈت بال مکند عرش ملسیانی کا شعر ہے

اتر آئے خود عرش و کرسی سے جلوے
نبوت کا اوج کمال اللہ اللہ

اس طرح کے اشعار کے علی الرغم غیر مسلم شعرا کے یہاں محبت وعقیدت کا ایک جذبہ موجزن دکھائی دیتا ہے، اقبال نے تو کہا تھا کہ 'میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے' جبکہ جاوید وشسٹ کہتے ہیں:

اک برہمن ہند تمھیں پیار کرے ہے
چوٹی سے ہمالہ کی نمشکار کرے ہے

روایت کی جس پاس داری اور احترام کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا گیا ہے، اس کی ایک نمایاں مثال ہمیں اردو مثنوی کی روایت میں ملتی ہے۔مثنوی میں پہلے حمد، نعت اور منقبت کے اشعار ہوتے ہیں۔اسے مشترکہ تہذیب کا فیضان ہی کہا جائے گا کہ چاہے وہ میر حسن ہوں یا دیا شنکر نسیم سب کے

یہاں نہ صرف اس روایت کی پاس داری ملے گی، بلکہ اشعار سے یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے اسے کہنے والا کون ہے۔مثنوی لکھتے وقت شعرا اس صنف کی ہیئت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ دکن سے لے کر شمال تک بلا تخصیص مثنویوں کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر حمد حق و مدحت پیمبر

غیر مسلم شعرا کے یہاں نعتیہ شاعری میں ان تمام لوازم کا اہتمام ہمیں ملتا ہے چونکہ روایت سے یہ لوگ واقف ہیں، اس لیے محاورے سب وہی استعمال کر رہے ہیں، جو عام شعرا کرتے ہیں یعنی سرو کائنات، ماہ عرب، آمنہ کے لال مدح سرائے مصطفی، نور ہدایت وغیرہ۔عرش ملسیانی کا شعر ہے:

حامل جلوہ ازل پیکر نور ذات تو
شان پیمبری سے ہے سرورِ کائنات تو

قابل ذکر بات یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعت لکھتے وقت غیر مسلم شعرا نے اپنے مراکز عقیدت سے تقابل کی کوئی صورت نہیں نکالی یعنی انھوں نے خالصتاً اسے نعت رہنے دیا۔ گلزار دہلوی کہتے ہیں:

محمد مصطفی ماہ عجم رشک عرب سن لے
برہمن زادہ کشمیر کی فریاد لب سن لے

قابل غور پہلو یہ بھی ہے کہ ہندستان کے تناظر میں دیگر نعت گو شعرا کی طرح غیر مسلم شعرا نے بھی نعت کے عمومی مضامین کو اپنے اپنے انداز میں باندھنے اور ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور خوب کی ہے۔مثلاً واقعہ معراج پر بے شمار شعر ملتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں لکھنؤ کے ایک شاعر رام پرکاش بیخود کہتے ہیں:

جہاں ہو آئے ہیں سرکار چودہ سو برس پہلے
وہاں سے اہل دنیا عربوں کھربوں میل پیچھے ہیں
ترقی لاکھ کر لی ہو زمانے نے مگر بیخود
مرے آقا سے یہ سائنس کیا جبرئیل پیچھے ہیں

سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے اہم باب آدمیت کی معراج یعنی انسانی حقوق کی بحالی ہے۔ ذات پات کا وہ نظام جس میں ہندستان آج بھی غلطاں و پیچاں ہے۔اسلامی تعلیمات کا یہی وہ حصہ ہے جو برادران وطن کو سب سے زیادہ اپیل کرتا ہے۔اقبال نے تو یہ کہا تھا کہ ''ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز''۔ پنڈت ہری چند اختر اپنی نعت میں کہتے ہیں:

آدمیت کا غرض ساماں مہیا کردیا
اک عرب نے آدمی کا بول بالا کردیا

اس طرح کے بے شمار مضامین ہیں جو غیر مسلم نعت گو شعرا نے اپنی نعتوں میں باندھے ہیں۔

پروفیسر ریاض مجید نے پہلی ناکام جنگ آزادی کے بعد کے دور کو ہندو شاعروں کی نعت گوئی کا حقیقی دور قرار دیا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے منشی شنکر لال ساقی (۱۸۹۰۔۱۹۲۰)، مہاراجہ سرکشن پرشاد، دلورام کوثری اور عرش ملسیانی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔

منشی شنکر لال ساقی (۱۸۹۰۔۱۹۲۰) سکندر آباد کے رہنے والے تھے۔ یہ غالب، ذوق اور بہادر شاہ ظفر کے مشاعروں میں شامل رہے ہیں۔البتہ غالب سے زیادہ استفادہ کیا نیز ان کے مشہور شاگرد ہر گوپال سہائے تفتہ سے قرابت داری تھی۔انھوں نے نعتیں بھی کہی ہیں۔ایک جگہ کہتے ہیں:

میں اگر خاک نشین در احمد ہوں گا
رفعت عرش کی ہمسر مری پستی ہوگی

اسی نعت میں وہ یہ بھی کہتے ہیں:

نعت لکھتا ہوں مگر شرم مجھے آتی ہے
کیا مری ان کے مدح خوانوں میں ہستی ہوگی

یہ اشعار محض عقیدت ومحبت کا اظہار نہیں بلکہ اردو نعت کے عمومی رویے اور رجحان کے بھی غماز ہیں:

ہوئی کافور نور مصطفی سے شرک کی ظلمت
سیاہی سے ندامت کی دل کفار کالا ہے
صفات ذات احمد لکھ سکوں کیا میری طاقت ہے
خیال اہل دانش جب یہاں مکڑی کا جالا ہے

اس سلسلے کا ایک اہم نام مہاراجہ سرکشن پرشاد کا ہے۔شعروادب سے انھیں والہانہ تعلق تھا۔ ہندستان کی مشترکہ تہذیب وثقافت کے ایک عمدہ نمائندہ کے طور پر یاد کیے جاتے ہیں۔فن قرآت کو باقاعدہ سیکھا اور تلاوت وغیرہ کا اہتمام کرتے تھے۔گیتا رامائن اور گرنتھ صاحب سے بھی واقف تھے۔ہندو مذہب کے اہم پیشواؤں پر جہاں مضامین اور نظمیں لکھیں، وہیں بزرگان دین اور اولیاء اللہ کی شان میں مدحیہ قصائد لکھے۔شاعری میں دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ نعت گوئی میں بھی کمال پیدا کیا۔نعتیہ شاعری میں سرور کائنات کے بعد مدینہ سے عقیدت ومحبت کا اظہار ایک عام بات ہے اور مضمون کو نہ جانے کس کس طرح شعرا نے باندھا ہے۔مہاراجہ سرکشن پرشاد نے بھی ایک نعت مدینہ ردیف میں کہی ہے۔یہ نعت مدینۃ النبی کے عشق میں ڈوبی ہوئی ہے۔ایک شعر میں وہ کہتے ہیں:

خاک رہ یثرب کو بناؤں گا میں سرمہ
دیکھوں گا ان آنکھوں سے جو میدان مدینہ

اعتماد ویقین کی ایک فضا یہ بھی دیکھیں:

کیوں میری شفاعت میں بھلا دیر لگے گی
کیوں مجھ کو نہیں جانتے سلطان مدینہ

یہ جذبہ بھی قابل قدر ہے:

کافر ہوں کہ مومن ہوں خدا جانیے کیا ہوں
پر بند ہ ہوں ان کا جو ہیں سلطان مدینہ

نعتوں میں منقبت کے اشعار کی روایت ہے۔واضح رہے کہ لکھنو میں نعتیہ شاعری کا ایک اہم حصہ مدح صحابہ ہے۔اس تناظر میں شاد کا یہ شعر دیکھیں:

بو بکر و عمر عثمان و علی تھے چار عناصر ملت کے
کثرت وحدت میں ہے جیسے حال وہ تھا ان چاروں کا

دوسرا مصرعہ ہندستان کے خاص تناظر میں کہا گیا ہے،اس کا خاطر خواہ لطف ہمیں لوگ اٹھا سکتے ہیں۔ دلورام کوثری کو خواجہ حسن نظامی سے عقیدت ومحبت تھی۔دلورام کے انتقال پر ان کا نعتیہ کلام خواجہ

صاحب نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔ان کے مجموعہ نعت کا نام ''ہندو کی نعت تھا'' جسے تیسری بار خواجہ حسن نظامی نے ۱۹۳۷ میں شائع کیا تھا۔اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۴ میں شائع ہوا تھا۔

کوثری کا تعلق ضلع حصار سے تھا۔ان کی نعتیں ایک طرف جہاں عقیدت ومحبت کا شاہ کار ہیں وہیں انھوں نے اپنے ہندو ہونے کا ذکر اپنی مختلف نعتوں میں کیا ہے اور یہ بھی فخر کے ساتھ کہا ہے کہ میں ہندو سہی مگر ثنا خوان مصطفی ہوں۔ایک مسلسل نعت میں انھوں نے لکھا ہے کہ ہندو سمجھ کے جب جہنم میں مجھے صدا دی تو پاس جب اس کے گیا تو وہ مجھ کو نہیں جلا سکی، اس نے وجہ دریافت کی اور مجھ سے نام اور مذہب پوچھا، میں نے بتایا کہ ہندو ہونے کے باوجود چونکہ میں ثنا خوان مصطفی ہوں، اس لیے تیرا شعلہ مجھ تک نہیں آسکا۔آخری شعر ہے

ہے نام دلو رام تخلص ہے کوثری　　اب کیا کہوں بتا دیا جو کچھ بتا سکا

انھیں حسان الہند کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔ایک نعت میں وہ خود کہتے ہیں:

ہے حسان پہلا تو میں دوسرا ہوں　　نہیں فرق اول میں ثانی میں رکھا
خدا نے انھیں سونپی محفل عرب کی　　مجھے بزم ہندوستانی میں رکھا

انھوں نے اپنی کئی نعتوں میں اس طرح کے مضامین نظم کیے ہیں کہ ایک ہندو جو کہ بت پرست ہے مگر نعت احمد لکھتا ہے۔اس لیے اس کی بخشش ہوگئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندو نعت شعرا نے کتابوں اور شعری روایتوں کے ساتھ ساتھ عام ہندستانی معاشرہ میں رائج تصور سے بھی فائدہ اٹھایا۔شفاعت کے تصور میں جہاں سرکار دو عالم کو بعض حوالوں سے مرکزی حیثیت دی جاتی ہے، غالباً اسی تناظر میں دلو رام کوثری نے اپنے جذبات و احساسات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی رعایت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

عرش ملسیانی (۱۹۰۸) ملیسان ضلع جالندھر سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے والد پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی داغ کے شاگردوں میں تھے۔شعر و ادب کا خداد ملکہ حاصل تھا۔شاعری، صحافت، ترجمہ نگاری کے علاوہ متعدد اہم کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔آہنگ حجاز ان کی نعتوں کا مجموعہ ہے، جس کا دیباچہ عبدالماجد دریا آبادی نے لکھا تھا۔ان کا خیال ہے کہ قومی اور اجتماعی حیثیت سے عرش ایک بڑی

خدمت انجام دے رہے ہیں یعنی ملک میں دو بڑی قوموں کے درمیان محبت اور رواداری کے جذبے کو شاعری کے توسط سے انھوں نے فروغ دیا ہے۔ پروفیسر ریاض مجید کا خیال ہے کہ عرش ملسیانی اپنی نعتوں میں صداقت اور حقیقت پسندی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔

عرش ملیسانی کی نعتیں عقیدت ومحبت کے ساتھ ساتھ لفظیات کے خاص اہتمام کی وجہ سے بھی اہمیت کی حامل ہیں:

توحید کی مے کا لطف اٹھا ایمان کے جام و مینا سے
جب ساقی، ساقی کوثر ہو پھر عذر بھلا کیوں پینے میں
یہ امی پیمبر کا جوش فصاحت
بشر کی یہ شان حقیقت نمائی

سرکار دو عالم کی تعریف وتوصیف میں ان کے دلی جذبات واحساسات اس طرح شامل ہوتے ہیں کہ شعر روانی اور برجستگی کی ایک مثال بن جاتا ہے:

ہاں ہاں تمہیں تو ہو دل عالم کے دل نواز
دلدار و دل نشین و دلآرا تمہیں تو ہو
تم پر ہمیشہ مطلع عالم کو ناز ہے
رہتا ہے اوج پر جو ستارا تمہیں تو ہو

ہندستان کے مخصوص ثقافتی اور تہذیبی پس منظر میں غیر مسلم نعت گوشعرا نے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس سے جہاں باہمی انس ومحبت اور اور اخوت ویگانگت کی فضا قائم ہوئی ہیں، اردو زبان وادب کا یہ رویہ بھی سامنے آیا کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ان نعتوں نے منافرت اور دشمنی کے ماحول میں سرو کائنات کے اخلاق اور مروت کو رہنما بنایا۔

ہندستان کے کثیر ثقافتی اور تہذیبی ماحول کو یقینا نعتیہ شاعری کے سبب بڑی تقویت ملی ہے۔

☆......☆......☆

اصلاح معاشرہ

پیغمبرانہ دعوت وتبلیغ کے چند بنیادی اصول

مولانا محمد قمر الزماں ندوی
مدرسہ نور الاسلام کنڈہ پرتاپ گڑھ

وعظ و نصیحت تقریر و خطابت اور دعوت و تذکیر کا فائدہ انسان کو ضرور پہنچتا ہے، اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے خاصیت رکھی ہے، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آج وعظ و نصیحت، جلسہ و جلوس، حلقہ درس و تدریس اور تقریر و تبلیغ سے فائدہ نہیں پہنچتا، وہ گویا ایک مسلمہ حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دعوت و تذکیر اور وعظ و نصیحت میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ اس سے فائدہ ضرور پہنچتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وذکر فان الذکری تنفع المومنین

”اور آپ نصیحت کیجئے، اس لیے کہ نصیحت مسلمانوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔“

اگر دعوت و تبلیغ کا کام بے اثر یا غیر مفید معلوم ہوتا ہے یا اس کے نتائج مثبت کے بجائے منفی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں تو یقین جانیے کہ ہم نے دعوت کے پیغمبرانہ اصول، منہج اور اسلوب کو چھوڑ دیا ہے اور اس میں ہم نے ذاتی اغراض و مقاصد اور مفاد نیز اپنی ذاتی خواہشات اور من مانا اصول وضوابط کو اس میں شامل اور داخل کر لیا ہے جو قرآن وسنت کے مسلمہ اصول اور منہج سے متصادم ہے۔

یہ حقیقت ذہن نشین رہے کہ تبلیغ و دعوت درحقیقت انبیاء کرام علیہم السلام کا کام ہے، یہ پیغمبرانہ طریقہ اور مشن ہے اور جب تک اسے انہی اصولوں، ضابطوں اور طریقوں کے مطابق انجام نہیں دیا جائے گا جس طریقے اور نہج پر انبیاء کرام علیہم السلام نے انجام دیا، اس وقت تک وہ موثر، کارگر اور مفید نہیں ہو سکتا۔

پیغمبرانہ دعوت کی چند امتیازی خصوصیات کتاب وسنت اور سلف کی تحریروں کی روشنی میں:

انبیاء کرام علیہم السلام کی سب سے پہلی اور بنیادی خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ ان کو اپنی امت کی

اصلاح کی فکر اس قدر شدت کے ساتھ لگ جاتی تھی کہ وہ طبعی تقاضوں سے بھی آگے بڑھ جاتی تھی، یہاں تک کہ پیغمبر وقت اس فکر میں گھلنے لگتے تھے تو اللہ کی طرف سے تسلی کا سامان کیا جاتا اور ارشاد ہوتا: لعلك باخع نفسك الا يكونوا مومنين

"شاید آپ اس غم میں اپنی جان ہلاک کرنے والے ہیں یہ لوگ مومن کیوں نہیں بنتے۔"

اس لیے ایک داعی اور مبلغ کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ اس کو پیغمبرانہ فکر، کڑھن، درد اور سوز کا کوئی حصہ نصیب ہو۔ چنانچہ اسلاف امت میں بھی جن جن کو اس فکر کا جتنا حصہ اور نصیبہ ملا، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت اور تبلیغی مشن میں اسی قدر برکت اور ترقی عطا فرمائی اور اتنے ہی بہتر نتائج اور ثمرات پیدا فرمائے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کو دعوت و تبلیغ کا ایسا تقاضا ہوتا تھا جیسا بھوک کے وقت کھانے اور پیاس کے وقت پینے کا تقاضا ہوتا ہے جس طرح انسان طبعی تقاضوں سے صبر نہیں کر سکتا، اسی طرح دعوت کے مواقع پر دعوت سے صبر نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت میں تاثیر بھی ایسی عطا فرمائی کہ ان کے وعظ سے سینکڑوں انسان بیک وقت تائب ہوتے تھے۔ یہی کیفیت اور حالت حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، مولانا یوسف کاندھلویؒ اور بہت سے علماء اور اہل علم کی تھی۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی تبلیغ و دعوت کا دوسرا اہم امتیاز یہ ہے کہ وہ نتائج سے بے فکر اور بے پروا ہو کر دعوت و تبلیغ میں مسلسل مشغول رہتے اور حوصلہ شکن حالات میں بھی اپنی بات متواتر اور پابندی کے ساتھ کہتے چلے جاتے جہاں اور جس موقع پر کسی شخص کو اچھی اور مفید بات پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ آجاتا، اسے غنیمت جانتے اور اپنی بات مخاطب تک حکمت کے ساتھ ضرور پہنچا دیتے، اتمام حجت میں ذرا بھی دیر نہیں کرتے۔ دعوت کی دھن اور لگن اور نتائج سے بے پروا ہو کر، حکمت کے ساتھ اس محنت میں مشغول رہنا اور حوصلہ شکن حالات میں بھی اپنی بات متواتر کہتے رہنا، پیغمبرانہ دعوت کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت اور ان کی دعوتی زندگی کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ

ان پاک صفت گروہ اور طبقہ کو جہاں اور جس موقع پر کسی شخص کو بھی اچھی بات پہنچانے کا کوئی موقع مل جاتا، وہ اسے غنیمت سمجھ کر اپنی بات پہنچا ہی دیتے تھے۔

اس سلسلہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی اس مثال کو دیکھئے کہ وہ مدت سے عزیز مصر کی قید میں محبوس ہیں، گردونواح اور آس پاس میں کوئی معاون و مددگار، ہم نوا اور مونس وغم گسار نہیں، اس حالت میں جب جیل کے دو ساتھی خواب کی تعبیر پوچھنے کے لیے آتے ہیں، سوال کا کوئی تعلق دین و مذہب اور شریعت سے نہیں ہے لیکن پہلے تو انہیں مطمئن فرماتے ہیں کہ تمہارے خواب کی تعبیر مجھے معلوم ہے اور میں تمہیں بتا بھی دوں گا، پہلے ایک بظاہر قطعی غیر متعلق بات شروع کرتے ہیں اور وہ یہ کہ:

انی ترکت ملة قوم لا یومنون باللّٰہ و ھم بالآخرة ھم کافرون و اتبعت ملة آباء ابراھیم و اسحٰق و یعقوب ۔۔۔یصاحب السجن ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القھار

"بلاشبہ میں نے ان لوگوں کے دین کو چھوڑ دیا ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اپنے آباء واجداد میں سے ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کی پیروی کی ہے اور اے قید خانے کے ساتھیو! کیا متفرق پروردگار ماننا بہتر ہیں یا وہ اللہ جو ایک اور قہار ہے۔"

اور اس طرح خواب کی تعبیر بتانے سے پہلے اپنی دعوت اور دینی پیغام انہیں پہنچا دیا اور نبوی مشن کو جاری کر دیا۔

دعوت کی اس تڑپ اور تبلیغ کی اس لگن کا حاصل یہ ہے کہ انسان بات پہنچانے کے مواقع کی تلاش میں رہے جب جتنا موقع مل جائے، اس سے فائدہ اٹھائے اور دعوت سے کسی مرحلے پر تھکنے یا اکتانے کا نام نہ لے لیکن ساتھ ہی یہ نکتہ اور ہدایت بھی ذہن میں رہے کہ لوگوں کا داروغہ بن کر مدعو کے پیچھے نہ پڑے بلکہ اپنی بات موثر سے موثر انداز اور بہتر سے بہتر اسلوب میں حکمت اور دانائی کے ساتھ کہہ کر فارغ ہو جائے لیکن نہ مسلط ہونے کا طریقہ اختیار کرے اور نہ مایوس ہو کر بیٹھے۔

پیغمبرانہ دعوت و تبلیغ اور دیگر معاشی تعلیمی اور اصلاحی تحریک میں ایک بنیادی فرق ہے، وہ فرق یہ ہے کہ عام سیاسی معاشی اصلاحی اور تعلیمی تحریکات محدود اور وقتی مقاصد کے لیے اٹھتی ہیں اور ان کے

حصول کے بعد ان کا کام ختم ہوجاتا ہے۔اس کے مقابلہ میں پیغمبرانہ دعوت مستقل اور ابدی مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ہوتی ہے اور وقتی مسائل سے وہ صرف ناگزیر حد تک تعرض کرتی ہے اور زندگی کی حالی اور مقصود بالعرض قدروں کو محض وسیلہ و ذریعہ کی حد تک مستحق توجہ سمجھتی ہے اور اپنے عمل اور جدوجہد میں وہ زندگی کی حقیقی اور مقصود بالذات قدروں ہی کو سامنے رکھتی ہے۔

پیغمبر اور رسول اپنے زمانے میں لوگوں کو پہلے حقیقی مقصد سے روشناس کرتے ہیں اور پھر اسی کے مطابق سیرت سازی کا کام کرتے ہیں اور ذھن و دماغ اور فکر و نظر کی تعمیر کا کام اس وقت تک کرتے ہیں جب تک مقصد حیات کی عقیدت و احترام اور محبت دل کی گہرائیوں میں اتر نہ آئے۔اس طریقہ سے تربیت یافتہ اور پختہ کار انسانوں کا ایک گروہ تیار ہوجاتا ہے جس کا عزم و یقین کفر و باطل کے آہنی قلعوں کو پاش پاش کردیتا ہے اور جس کی نگاہ بڑے بڑے پرغرور سروں کو اپنے آگے جھکا دیتی ہے اور جس کی صدائے عشق ملوک وسلاطین کے سر بفلک ایوانوں میں زلزلہ پیدا کردیتی ہے۔

پیغمبرانہ دعوت و تبلیغ کا ایک اہم عنصر مخاطب کی شفقت اور مدعو سے بے انتہا لگاؤ، انس اور تعلق ہے۔انبیاء کرام علیہم السلام کے یہاں دعوت و تبلیغ میں یہ عنصر بہت غالب رہا۔انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ کا داعیہ شفقت محبت اور خیر خواہی و ہمدری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔اپنی برتری اور افضلیت و حاکمیت جتلانے یا دوسرے کی تحقیر کا ان کے یہاں شائبہ نہیں۔

قرآن حکیم میں بیشتر مواقع پر دعوت و تبلیغ کو لفظ انذار سے تعبیر فرمایا ہے جس کا لفظی ترجمہ لوگ ڈرانا کرتے ہیں لیکن درحقیقت عربی زبان میں انذار اس ڈرانے کو کہتے ہیں جس کا محرک دوسرے پر شفقت ہو جیسے باپ بیٹے کو آگ سے ڈراتا ہے لیکن اس کے برعکس اگر ایک ظالم و جابر بادشاہ اور حکمراں اپنے کسی محکوم اور ماتحت کو کسی سزا سے ڈرائے تو اس کو انذار نہیں کہا جائے گا۔اس کو ہم اس تمثیل سے سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ڈاکٹر کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی بیمار سے نفرت کرے اور جو طبیب یا ڈاکٹر نفرت کا مرتکب ہو وہ کبھی کامیاب طبیب اور ڈاکٹر نہیں ہوسکتا،اسی طرح داعی و مبلغ کو بھی بدتر سے بدتر کافر یا فاسق و فاجر اور بددین و بے عمل انسان سے بھی نفرت نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس پر ترس اور رحم کھا کر اس پر محنت کرنی چاہیے۔

پیغمبرانہ دعوت کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بات کہنے کے لیے ایسا موقع اور ایسا ماحول تلاش کرتے ہیں، جہاں وہ حکمت سے اپنی بات رکھ سکیں تاکہ ان کی دعوت زیادہ موثر ہو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور آپ کے واسطے سے پوری امت کو مخاطب کیا ہے کہ اللہ کے راستے کی طرف حکمت اور سوجھ بوجھ سے دعوت دیجئے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب داعی حق کے دل میں جذبہ لگن اور خلوص وللّٰہیت ہوتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے قلب پر حکمت کا القا کرتے ہیں اور اس کے لیے حکمت کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ اس وقت داعی و مبلغ کو یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون سی بات کہنے کے لیے کون سا موقع اور محل مناسب ہوگا۔

پیغمبرانہ دعوت کے اصول میں سے جہاں حکمت و شفقت ضروی اور لازمی ہے، وہیں موعظہ حسنہ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ موعظہ حسنہ پیغمبرانہ دعوت کا ایک اہم اور بنیادی اصول ہے، موعظہ حسنہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ دعوت کے لیے انداز بیان اور اسلوب ایسا اختیار کرے جو نرمی ہمدردی اور شفقت و محبت اور دلسوزی کا آئینہ دار ہو۔ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس اللہ تعالیٰ نے بھیجا اور یہ ہدایت فرمائی: قولا له قولا لینا

"تم دونوں اس سے نرم بات کرنا۔"

پیغمبرانہ دعوت کے اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نے دعوت و تبلیغ کے لیے ہمیشہ مہذب، اعلیٰ اور ناشائستہ زبان استعمال کی، کسی نبی اور رسول کی قوم اور ان کے مخالفین نے کبھی ان پر غیر مہذب اور غیر معیاری و ناشائستہ زبان کے استعمال کا الزام لگایا ہو اس کا ریکارڈ نہیں ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام نے کبھی طنز و تعریض اور اور طعن و تشنیع کا انداز نہیں اپنایا۔ ان کی تردید و تنقید جادلھم بالتی ھی احسن کے معیار اور کسوٹی پر ہوتی، اس کے حدود سے متجاوز نہیں ہوتی۔ ان کے یہاں سخت کلامی نہیں پائی جاتی تھی وہ ہمیشہ سخت سے سخت تنقید اور طعن و تشنیع کے جواب میں بھی محبت اور نرمی سے جواب دیتے بلکہ گالیوں کے جواب میں بھی پھول برساتے تھے۔

☆......☆......☆

یادگارِ زمانہ

حضرت مولانا قاری محمد عثمان منصور پوری
یادوں کے نقوش

ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی

[ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی جید عالم دین، کامیاب مدرس ہونے کے ساتھ منجھے ہوئے ادیب ،محبوب قلمکار اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔آپ آٹھ برس دارالعلوم حیدرآباد (دکن) کے نائب مفتی رہے،جبکہ ۲۰۰۸ء تا حال دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔آپ نے ”آزادی سے پہلے علماء دیوبند کی سوانح نگاری کا سائنٹفک تجزیہ“ کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا۔النخیل کے لیے لکھی گئی آپ کی تحریر پیشِ خدمت ہے۔ان شاءاللہ آپ کی تحریریں النخیل کی زینت بنتی رہیں گی۔ادارہ]

میرے گرامی قدر استاذ محترم حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی بالکل خاموشی سے جوارِ رحمت میں چلے گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ایسا نہیں لگتا تھا کہ اتنی جلدی نکل جائیں گے۔ خیر تقدیر الٰہی! جس کو کوئی نہیں جانتا، اللہ تعالیٰ ہی خالقِ ہر دو جہاں ہیں اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہر ذرہ ہے۔

حضرت کی وفات سے عجیب سناٹا چھا گیا، دارالعلوم سونا سونا لگ رہا ہے، مسندِ اہتمام سونی دِکھ رہی ہے، مسندِ حدیث کی رونق چلی گئی، تحفظِ ختمِ نبوت کے شعبے کا سر بے تاج نظر آرہا ہے، منحرف فِرق اور باطل مکاتبِ فکر کی سرکوبی کا شعبۂ ”محاضرات علمیہ“ بے سرپرست نظر آرہا ہے، قادیانیت کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کا جذبہ رکھنے والا مجاہد میدانِ کارزار میں نظر نہیں آرہا ہے، وہ مکینک جس کی جادوئی حکمت وتدبیر سے دارالعلوم کی مشین کا ہر پرزہ اپنی جگہ متحرک نظر آرہا تھا، اب وہ خود اپنی دکان بڑھا

گیا ہے، ان کی رحلت پر وہ مالی بھی غمگین ہے جو روزانہ گلشنِ دارالعلوم کے گلہائے رنگارنگ کا ایک گلدستہ تیار کر کے دفتر اہتمام میں حضرت کے سامنے رکھتا تھا اور اپنی خدمت پر نازاں تھا، ایک دن حضرت نے پوچھا: کیا کام کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا: چمن بندی کے شعبے میں ہوں، گلشن کی دیکھ ریکھ کرتا ہوں، مختلف قسم کے پھول لگاتا ہوں، پوچھنے پر بہت سے پھول کے نام گنوائے، اس پر فرمایا: اتنے پھول کس کام کے؟ کبھی دکھایا بھی تو کرو، چنانچہ وہ روزانہ ایک گلدستہ تیار کرتا اور میز پر جا کر رکھ دیتا، آج ان کی رحلت پر وہ بھی بہت غم زدہ ہے اور وہ میز بھی بے رونق دکھ رہی ہے، جس پر گلدستہ سجتا تھا۔

آخری ملاقات: رمضان المبارک چودہ سو بیالیس ۱۴۴۲ھ کا دوسرا عشرہ تھا، کسی جنازے کے لیے احاطۂ مولسری میں تشریف لائے تھے، اس وقت معلوم ہوا کہ ایک اور جنازہ آنے والا ہے، انتظار میں سب لوگ کھڑے تھے، شمال کی مولسری کے پاس قاری صاحب کھڑے تھے، جب انتظار کا وقفہ زیادہ ہونے لگا تو ہم نے سوچا کہ حضرت کے لیے کرسی لائی جائے، شعبۂ کمپیوٹر کے ایک ملازم نے جلدی سے ایک کرسی نکالی، میں لے کر دوڑا ہوا خدمت میں پہنچا تو فرمایا: نہیں، نہیں، ضرورت نہیں، مجھے کھڑے رہنے میں کوئی زحمت نہیں ہے، لے جاؤ! میں رکا ہوا اصرار کرتا رہا۔ ادھر دوسرا جنازہ آ گیا، فرمایا: دیکھو آ گیا، اب لے جاؤ، چنانچہ میں واپس لے کر آ گیا، چوں کہ سارا مجمع کھڑا تھا تو حضرت کو بیٹھنے میں تکلف ہوا، حالاں کہ اس دن قدرے نقاہت بھی محسوس ہو رہی تھی۔

اس سے کئی دن پہلے مسجدِ قدیم سے ظہر کی نماز پڑھ لوٹ رہے تھے، میں پیچھے تھا، متوجہ ہوئے اور پیار سے فرمایا: مولوی اشتیاق! میں جی کہہ کر قریب ہوا، فرمایا: تمہارے والد صاحبؒ کی وفات کی خبر ملی تھی، بڑا قلق ہوا، دفتر اہتمام میں دعا بھی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں!، میں نے اس پر آمین کہیں اور پیچھے پیچھے چلتا رہا، یہاں تک کہ وہ مطبخ کی طرف اپنی رہائش گاہ کے لیے مڑ گئے، چند دنوں کے بعد طبیعت ناساز ہوئی اور بہت زیادہ بھی نہیں، گھر پر ہی علاج چلتا رہا، مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے شدہ وقت قریب آتا گیا۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

شفقت و مناسبت: اساتذہ سب ہوتے ہیں جن کے سامنے کتاب کھول کر پڑھی جاتی ہے،

زانوئے تلمذ تہ کیا جاتا ہے، مگر "مناسبت" اللہ کا انعام ہے، ہر ایک سے نہیں ہوتی، جس استاذ کی شفقت وعنایت جتنی زیادہ ہوتی ہے، اسی سے اتنی ہی عقیدت، پھر مناسبت کے بعد محبت بھی ہو جاتی ہے، حضرت استاد محترمؒ کو پہلی مرتبہ اس وقت دیکھا جب مؤطا امام محمد کا سبق متعلق ہوا، گھنٹے کے بعد قدرے انتظار کرنا پڑتا، جب سارے طلبہ سراپا اشتیاق ہوجاتے، تب تشریف لاتے، شیرانی زیب تن ہوتی، نگاہیں نیچی رکھے، مسندِ تدریس پر بیٹھتے اور حدیث کی سند پر گفتگو کرتے، پھر اجزائے حدیث کو الگ الگ سمجھاتے، پھر مسالک بیان کرتے، امام محمد کی تعبیر کی خوبی سمجھاتے اور احناف کی ترجیحات بڑے اعتدال سے ذکر کرتے، الفاظ وتعبیرات میں برجستگی اور شگفتگی دل آویز رہتی تھی۔

حضرت الاستاد کا یہ انداز بڑا اچھا لگنے لگا، عقیدت کے بعد مناسبت بھی پیدا ہونے لگی، دوٗرہ حدیث شریف سے امتیازی نمبرات کے ساتھ کامیابی حاصل ہوئی، پھر افتاء میں داخل ہوا، محاضرات کا سلسلہ شروع ہوا، اس زمانے میں قادیانیت ملک کے گوشے گوشے میں دندنا رہی تھی، ارادہ ہوا کہ "ردقادیانیت" کے موضوع کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے، آخر یہ کیا بلا ہے جو اپنے سیلاب بلاخیر میں آبادی کی آبادی کو بہا لے جا رہی ہے، اس کے لیے ایک تو "شعبہ مناظرہ" میں داخلہ لیا، دوسرے "ردِقادیانیت" پر پیش کیے گئے حضرت کے محاضرات کو سامنے رکھ کر مضمون نگاری شروع کی، اس سے اور بھی مناسبت میں اضافہ ہوا، پھر جب محاضرات کے اسباق شروع ہوئے تو ہمہ تن گوش ہوکر حضرت قاری صاحب کی باتیں سنتا اور نئی باتوں کو نوٹ بھی کرتا تھا، اس طرح افتاء کا سال پورا ہوا اور حضرت قاری صاحب سے محبت ہوگئی، اب جہاں کہیں سے گزرتے، دیکھتا تو رک کر دیکھنے لگتا، مجھے ان کی شخصیت میں کشش کی بہت سی جہات نظر آتی تھیں لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ آپ کی نظرِ عنایت بھی میری طرف ہے اور اسی کا یہ اثر ہے۔ غرض یہ کہ اگلے سال "تدریب افتاء" میں داخلہ ہوا اور تمرینِ افتاء حضرت الاستاذ مفتی محمود حسن بلندشہری مدظلہ العالی کے پاس تھی، "ردقادیانیت" کے موضوع پر ملک بھر میں پروگرام ہوتے تھے، دہلی میں جمعہ کے دن بہت سی مسجدوں میں اس موضوع پر بیان کا نظام حضرت نے بنایا، اس کے لیے اساتذہ کرام کے ساتھ تخصص وتکمیلات کے طلبہ کی بھی

ترتیب بنی، اس میں میرا بھی نام تھا، ہم لوگ صبح چار بجے والی فاسٹ پسنجر سے دہلی پہنچے، میرا انتخاب حضرت قاری صاحب کی خدمت کے لیے ہوا، ساتھ میں حضرت مفتی صاحب مدظلہ بھی تھے، دفتر جمیعت کے پاس ایک آٹو رکشہ پر بیٹھے، اس نے ایک جگہ لے جا کر اتار دیا، اترنے کے بعد معلوم ہوا کہ مسجد یہاں سے دور ہے، تقریبا ڈیڑھ کلومیٹر ہے۔

نادر تواضع: اتنے میں ٹھیلی والا آیا جو اینٹ ڈھو رہا تھا، اس پر اینٹ کی سرخیاں بڑی مقدار میں پڑی تھیں، ہم نہادھو کر صاف کپڑا پہنے نماز کے لیے جا رہے تھے، ٹھیلی والے نے کہا: حضرت! مسجد بہت دور ہے، یہاں رکشہ بھی نہیں ہے، نماز کا وقت قریب ہے، آیئے! اسی پر بیٹھیے! میں مسجد تک پہنچا دیتا ہوں۔ دھوپ میں پیدل چل کر بہت پریشان ہوجائیں گے! حضرت نے اس کی معقولیت بھری تقریر سن کر کہا: چلو اسی سے چلتے ہیں، مجھے اس پر بیٹھنے میں ادنیٰ تأمل ہوا کہ کپڑے سرخی سے گندے ہوجائیں گے لیکن میں نے کسی طرح سے اس کا اظہار نہیں کیا تھا، حضرت قاری صاحب کو کشف ہوگیا، آہستہ سے اپنا خوبصورت نفیس سفید رومال سر سے اتارا اور اس ٹھیلی پر بچھا دیا، ارشاد فرمایا: مولوی اشتیاق تم اس پر بیٹھو! کپڑے گندے ہوجائیں گے، میں بڑا پشیمان ہوا، اور جلدی سے رومال اٹھا کر جھاڑا اور ادب سے حضرت کو پیش کیا، ٹھیلی پر بیٹھ گیا۔ پسینہ کچھ زیادہ ہی آنے لگا، حضرت کی تواضع کا تاثر مجھے اندر سے جھنجوڑ چکا تھا، غرض ہم تینوں مسجد پہنچے، نماز کا وقت قریب تھا، حضرت سیدھے منبر پر پہنچے اور بیان شروع فرما دیا۔ نہایت ہی سادہ انداز میں مرزا غلام احمد قادیانی کی حماقتوں کو سمجھایا، اس کے دعوئ نبوت کا مطلب سمجھا کر اس کی تردید کی، "کلمۂ قادیانیت" کا مفہوم سمجھا کر "کلمۂ توحید" سے اس کا تقابل پیش کیا، جس سے سامعین نے صاف سمجھ لیا کہ قادیانیت اسلام کے مقابل ایک مستقل مذہب ہے اور قادیانی ہرگز مسلمان نہیں ہوسکتے، غرض تقریر کے بعد خطبہ پھر نماز ہوئی اور سنت ونوافل کے بعد واپسی کا ارادہ ہوا، مسجد کے باہر ایک رکشہ نظر آیا، اس سے آئی ٹی او لے جانے کی بات ہوئی۔

گرم رکشے پر شبنمی نصیحت: حضرت بائیں طرف بیٹھ گئے، نہایت ہی اطمینان سے بیٹھ کر اشارہ

کیا، آجاؤ! میں بیٹھتے ہی چونک سا گیا، دھوپ میں رکشہ توے کی طرح گرم ہو گیا تھا، تعجب تھا کہ اتنی نازک شخصیت کس طرح پُرسکون ہو کر بیٹھی ہے، اس تصور سے میں بھی بے تکلف اطمینان سے بیٹھا رہا، رکشہ جب آگے بڑھا تو حضرت نے گفتگو شروع کی: ”ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ ہمیں تو دھوپ میں رکشہ بھی نصیب ہے، تصور کرو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرب کی چلچلاتی دھوپ میں گرم پتھروں اور پہاڑوں پر کیسے پیدل چلے ہوں گے، دین کی تبلیغ کے لیے کتنی مشقتیں اٹھائی ہوں گی، طائف کی (ساڑھے پانچ سو فٹ) اونچی پہاڑی پر کیسے چڑھے ہوں گے، آہستہ آہستہ حضرت نے چند جملے ایسے ارشاد فرمائے کہ گرم رکشہ لطف دینے لگا اور چند لمحوں میں ٹھنڈا محسوس ہونے لگا، اس شبنمی نصیحت نے بڑا متاثر کیا، اکابر بزرگوں کی لمبی لمبی تقریریں بارہا سنی ہیں مگر جتنا اثر حضرت قاری صاحب کے چند جملوں نے کیا اتنا کسی نے نہیں کیا۔

ادنیٰ سی ضیافت پر خندہ پیشانی: وہاں سے ایک مدرسے میں آئے، جہاں کھانا طے تھا، دیکھا تو دسترخوان پر نہ تو سلیقے کے پلیٹ کٹورے تھے اور نہ ہی کھانا مزیدار، سلاد میں کھیرے اور پیاز کی کتلیاں بھی ایسی تھیں جیسے چاقو کے علاوہ کسی اور چیز سے کاٹی گئی، ناشپاتی کے بدل شکل ٹکڑے! لیکن حضرت بڑی قدردانی اور خندہ پیشانی سے تھوڑا تھوڑا اٹھاتے اور میزبان کو خوش کرتے ہوئے اللہ تعالی کی حمد وثنا کر رہے تھے، ہاں اخیر میں ”پیپسی“ ضرور آئی، اس زمانے میں یہی کالا مشروب بازاروں میں ملتا تھا اور لوگ بڑی ہوس سے پیتے تھے، بعد میں اس سے اچھے مشروب آئے پھر امریکی مصنوعات کی بائی کاٹ نے اس کی اہمیت کو اور گھٹا دیا، غرض میں نے یہ سوچا کہ حضرت اس کو ضرور پسند فرمائیں گے مگر آپ نے آہستہ سے منع کر دیا، بعد میں اس کی مضرتوں سے دنیا واقف ہوئی اور دور ہوئی، تب معلوم ہوا کہ ہمارے اکابر کتنے دوررس ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں!

تواضع: حضرت قاری صاحب اصول پسند اور بڑی متواضع شخصیت کے حامل تھے، دارالعلوم دیوبند میں علیا کے مدرس ہونے کے باوجود ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی سے بڑا متواضعانہ سلوک کرتے تھے، یہ آپ کی طبیعت ثانیہ تھی۔

(الف)......درجہ علیا کے مدرس، دارالاقامہ اور تحفظ ختم نبوت کے ناظم ہونے کے باوجود

حضرت الاستاذ مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے اسباق بخاری شریف میں حاضر ہوتے اور خوب استفادہ فرماتے تھے، جب ہماری جماعت کو **بخاری شریف کتاب الایمان** تبرکاً پڑھانے کے لیے حضرت تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت قاری صاحب پیچھے پیچھے آرہے ہیں، پورا گھنٹہ بیٹھ کر استفادہ کیا پھر ساتھ ہی واپس ہوئے اور غالباً **نسائی شریف کی کتاب الطھارۃ و الصلاۃ** کے اسباق میں بھی تشریف لاتے تھے،اس سے حضرت کی بے نفسی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(ب)......"تحفظ ختم نبوت" کے ناظم اعلیٰ حضرت استاذ محترم مفتی سعید احمد پالن پوریؒ سے مشورہ کے لیے سیدھے مکان پر تشریف لے جاتے، ساتھ میں فائلیں ہوتیں، طلبۂ کرام کے انتخاب کے لیے سب کو لے کر وہیں پہنچتے، مسودات و مقالاجات پر رائے لینے کے لیے بھی بارہا میں نے دیکھا، اس میں ذرہ برابر تکلف نہ فرماتے تھے۔

سفر میں دل داری اور نماز کا اہتمام: چار اسفار میں ناچیز کو حضرت کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، اس میں کئی چیزیں متاثر کن دیکھیں:

(الف)......نماز کا خوب اہتمام فرماتے، دہلی جیسے سفر میں پانچ، چھ گھنٹے اس لیے لگتے تھے کہ صحیح وقت پر نماز با جماعت اطمینان سے ادا فرماتے ہوئے جاتے تھے، ساتھ میں چھوٹی جائے نماز اور بڑا مصلیٰ ہوتا تھا، اطمینان سے رکتے اور معمولات پورے کرنے کے بعد چلتے۔

(ب)......راستے میں گزرتے ہوئے اگر کوئی چائے کے بہانے روکتا تو ضرور اس کی دل داری فرماتے، کھاتے تو بہت کم تھے، مگر سامنے والے کا دل خوش کر دیتے، ان کے لیے دعائیں کرتے۔

(ج)......وقت ضائع نہ کرتے، چلتے ہوئے یا تو خاموش تسبیحات پڑھتے رہتے یا کوئی کتاب اٹھا لیتے، غرض خالی نہ رہتے تھے۔

(د)......ساتھ رہنے والوں کا بھی خوب خیال رکھتے، خصوصاً دسترخوان پر بڑی محبت سے کھلاتے، جی خوش ہو جاتا تھا، ان اداؤں کو یاد کر کے آنسو آنے لگتا ہے۔

حیدر آباد کا سفر: دارالعلوم حیدر آباد میں "عظمت صحابہ سیمینار" تھا، مجھے خدمت کے لیے حضرت کے ساتھ رکھا گیا، اس میں کئی چیزیں بڑی متاثر کن تھیں:

(الف)......سب سے پہلے ٹکٹ وغیرہ کی تفصیلات معلوم کیں، دیو بند سے دہلی پھر واپسی وغیرہ کا انتظام معلوم کیا، ادارے نے جہاز کے ٹکٹ کے ساتھ ٹیکسی کا کرایہ پہلے بھیج دیا تھا، واپسی میں حضرت کو دہلی سے دیو بند کے لیے ٹیکسی لینی نہیں تھی، کوئی اور انتظام تھا تو آپ نے دارالعلوم حیدر آباد کے ذمہ دار کو واپسی کا کرایا واپس کیا اور ضرورت نہ ہونے کی صراحت فرمائی، یہ تھی معاملے کی صفائی، منتظمین بہت متاثر ہوئے۔

(ب)......اسی سفر میں حضرت کو دیکھا کہ جہاز میں سوار ہوتے ہی ایک کتاب نکالی اور اس کو پڑھتے رہے، اس میں سے نوٹس لکھتے رہے، پوری کتاب میں سے اپنا مطلوبہ حصہ پڑھ ڈالا، جب سیمینار میں حضرت کو بلایا گیا تو حضرت نے ڈائز پر اس نوٹ کو رکھ لیا اور نہایت ہی مرتب انداز میں بڑے اہم نکات پر گفتگو فرمائی، سامعین میں اہلِ علم وقلم کی تعداد اچھی خاصی تھی، سب نے حضرت کی گفتگو کی انفرادیت کو تسلیم کیا، منتظمین نے اس کو ریکارڈ کیا، حضرت کی خواہش تھی کہ کاغذ پر منتقل ہو کر مرتب ہو جائے، منتظمین نے اس کا وعدہ بھی کیا، مگر افسوس کے وہ نہ ہو سکا۔

(ج)......تقریر وتحریر میں کبھی بھی حضرت کو تکلف کرتے ہوئے نہیں دیکھا، بالکل سادہ انداز میں لکھتے اور بولتے تھے، باتیں ترتیب وار ہوتیں، پھر اخیر میں خلاصہ بھی پیش فرماتے تھے، سادہ اسلوب کے ساتھ موضوع اور مباحث کی ترکیز بھی ہوتی تھی، وہ اِدھر اُدھر نہیں بھکتے تھے، اس سے سامعین میں یکسوئی باقی رہتی تھی، یہ بات اس پروگرام میں بھی نظر آئی، صحابہ کرام کے سلسلے میں امت کے معتدل موقف کو نہایت ہی مدلل انداز میں پیش فرمایا تھا۔

اسی طرح اردو زبان میں بغیر مجبوری کے انگریزی الفاظ سے آپ بہت اجتناب کیا کرتے تھے اور اس کی نصیحت بھی کرتے تھے۔

درسِ مشکوٰۃ کا امتیاز: دارالعلوم دیو بند میں حضرت نے دسیوں سال مشکوٰۃ شریف کا سبق پڑھایا ہے، یہاں آپ کا امتیاز تھا کہ احکام کی احادیث کو بڑے اطمینان بخش انداز میں پڑھاتے تھے، مسلک کے موافق اور اس کے معارض دلائل کو سامنے لاتے اور بحث کرتے، وہ حدیث مشکوٰۃ کی تینوں فصلوں میں جہاں کہیں ہوتی، اس کی نشاندہی فرماتے، پھر احناف کی ترجیحات کو پیش کرتے

تھے، اس لیے طلبۂ کرام ان کو اپنی کاپیوں میں نوٹ کرتے تھے اور اسباق کی پابندی بھی خوب کیا کرتے تھے اور چھوٹ جانے پر افسوس کا اظہار بھی کرتے، میری یہ تمنا تھی کہ حضرت کے اسباق مرتب ہو کر شائع ہوں، میں نے ایک بار ملاقات کر کے اپنی تمنا کا اظہار کیا تو فرمایا: ٹھیک کہتے ہو، میرا جی بھی یہ چاہ رہا ہے، دیکھو اللہ تعالیٰ کیا اسباب پیدا فرماتے ہیں۔

دار العلوم میں پانچ گھنٹے پڑھانے کی وجہ سے میرے لیے سبق میں حاضر ہو کر مرتب کرنا بہت مشکل تھا، اس لیے میں یہ چاہتا تھا کہ کوئی پابند اسباق طالب علم سال بھر یہ کام کرے پھر اس کی ترتیب کی کوئی صورت بنے اور حضرت الاستاذ کی خدمت میں پیش ہو، مگر ہر تمنّا بر نہیں آتی!

ممتاز تربیت: حضرت قاری صاحب کے جملہ اوصاف میں نونہالوں کی تربیت کا پہلو بھی اپنا ایک امتیاز رکھتا ہے:

(الف)...... ہماری "معین مدرسی" کا زمانہ تھا، حضرت نے اپنے ایک عزیز کو میرے ساتھی مفتی محمد خالد نیموی مدظلہ کے سپرد کیا کہ اس کو فلاں فلاں کتاب اپنے کمرے میں پڑھا دیا کرو اور اسی عزیز کے ذریعے ایک کاپی بھجوائی کہ روزانہ کی حاضری اس میں نوٹ کرو اور ہفتہ میں ایک بار میرے پاس بھیج دیا کرو تاکہ میں دیکھ لوں کہ پابندی کر رہا ہے یا نہیں؟ یہ انداز مجھے بڑا اچھا لگا کہ طالب علم خواہی نخواہی پابند ہو گیا اور چل پڑا۔

(ب)...... حضرت دار الاقامہ کے ناظم تھے، فجر بعد حضرت اچانک کسی کمرے میں پہنچ جاتے، نماز نہ پڑھنے والے طلبہ کو جگاتے: جلدی نماز پڑھو! بہت تھوڑا وقت بچا ہے اور ساتھ ہی یہ فرماتے: تیسرے گھنٹے میں دار الاقامہ آ جانا!، جب طالب علم وہاں پہنچتا تو اس سے ایک درخواست لکھواتے کہ میں باجماعت نماز کے چھوٹنے پر شرمندہ ہوں، ایک ماہ تک روزانہ فجر کی اذان کے بعد آپ کے گھر حاضری دوں گا، اس طرح خود بخود طالب علم نماز کا پابند ہو جاتا تھا۔

(ج)...... اس طرح ایک دن فجر کی نماز کے بعد دیکھا کہ دو تین طلبہ دارِ جدید میں حضرت کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں، لنگی بنیائن میں ہیں، اپنے سر پر بستر لیے ہوئے ہیں، طلبہ دیکھ دیکھ کر مسکرا

رہے ہیں، میں نیا طالب علم تھا، قریب والے سے پوچھا یہ کون شخصیت ہیں؟ تو طلبہ نے حضرت کا نام بتایا اور بتایا کہ ناظم دارالاقامہ ہیں، ہفتہ، دس دن میں ایک، آدھ بار اس طرح ہو جاتا تھا تو پورا دارالعلوم نماز کا پابند رہتا، بلا کسی ڈانٹ ڈپٹ، پٹائی اور کھانا بند کیے مقصد حاصل!

راقم الحروف پر نظرِ کرم: میں ان خوش قسمت طلبہ میں سے ہوں جن پر حضرت استاذِ محترم کی نگاہ تھی، وہ میری ترقی کے لیے کوشاں تھے:

(الف)......جب "تدریب افتاء" کا دوسرا سال پورا ہوا تو ایک دن حضرت نے دفترِ اہتمام میں بلایا، جب وہ نائب مہتمم تھے، ارشاد فرمایا کہ "اگر اگلے سال حضرت مولانا محمد طاہر گیاوی مدظلہ کے مدرسے چلے جاتے تو اچھا ہوتا، وہاں فتویٰ نویسی مفتی کی ضرورت ہے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر کوئی ذی استعداد طالب علم ہو تو بھیجیے! سوچو اگر تمہاری رائے ہو تو میں بات کروں! لیکن کیوں کہ میرا ارادہ مادرِ علمی میں "معین مدرسی" کا تھا، اس لیے وہاں جانے کا اتفاق نہ ہوا۔

(ب)......"معین مدرس" کے بعد دارالعلوم حیدرآباد چلا گیا، وہاں سے ایک مرتبہ مادرِ علمی آنا ہوا تو حضرت سے ملاقات کے لیے جب حاضر ہوا تو بہت خوش ہوئے اور خیر خیریت کے بعد کہا: کیا تم کچھ انگریزی زبان بھی جانتے ہو؟ میں نے کہا: جی تھوڑا موڑا جانتا ہوں، کام چل جاتا ہے۔ فرمایا: مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانیؒ "مفتی پنجاب" ہیں، اب وہ ریٹائرڈ ہو رہے ہیں، وہاں ایک مفتی کی ضرورت ہے، اگر تم چلے جاتے تو اچھا ہوتا، میں نے کہا: ٹھیک ہے حضرت! مفتی سعید احمد صاحب سے مشورہ کر لیتا ہوں، اگر ان کی رائے ہوئی تو چلا جاؤں گا لیکن جب حضرت سے پوچھا تو فرمایا: نہیں، مت جاؤ! میں تمہیں اچھا مدرس دیکھنا چاہتا ہوں، دارالافتاء کا ایک خاص سرکل ہوتا ہے اور مدرسی میں مطالعہ کی آفاقیت ہوتی ہے، اس لیے وہاں کی رائے نہیں بنی۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اکابر اساتذۂ کرام کی بال بال مغفرت فرمائیں اور جنت الفردوس اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائیں!

☆......☆......☆

کتب نما

مشفق خواجہ: احوال وآثار

محمد بشارت نواز
نائب مدیر ماہنامہ النخیل

اردو زبان وادب کی آبرو، محقق، ادیب، نقاد اور شاعر مشفق خواجہ (ان کا اصل نام خواجہ عبدالحیؒ تھا، مشفق خواجہ ان کا قلمی نام تھا) ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد خواجہ عبدالوحید معروف علمی شخصیت اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ مشفق خواجہ نے ابتدائی تعلیم لاہور ہی میں حاصل کی، ۱۹۴۸ء میں اپنے والدین کے ہمراہ کراچی منتقل ہوئے، وہیں ۱۹۵۷ میں بی اے آنرز اور ۱۹۵۸ میں ایم اے کیا۔ دورانِ تعلیم بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، بابائے اردو نے مشفق خواجہ کا انجمن ترقی اردو میں اپنے معاون کی حیثیت سے تقرر کیا، جہاں آپ انجمن ترقی اردو کے رسائل "قومی زبان" اور سہ ماہی "اردو" کے مدیر رہے، بعد میں انجمن ترقی اردو کے تمام علمی کاموں کی نگرانی بھی آپ کے سپرد ہوگئی، ۱۹۷۳ میں آپ اپنی دوسری علمی مصروفیات کی وجہ سے انجمن ترقی اردو سے مستعفی ہوگئے، آپ کل سترہ برس انجمن سے وابستہ رہے۔ آپ کئی علمی، تحقیقی وادبی کتابوں کے مصنف ہیں، آپ ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کو مسافرانِ آخرت میں شامل ہوگئے۔

مشفق خواجہ کا شمار صفِ اولین کے محققین میں ہوتا تھا، تحقیق کے سمندر کی تہہ سے علم وادب کے بڑے نادر گوہر نکال کر لاتے رہے، ان کی تحقیق اردو ادب میں سب سے معتبر، سب سے مستند سمجھی جاتی ہے، تحقیق کے میدان میں آپ نے جو کارنامہ ہائے نمایاں سرانجام دیئے ان میں "جائزہ مخطوطات اردو"، "پرانے شاعر، نیا کلام"، "یگانہ چنگیزی" اور "تحقیق نامہ" سرفہرست ہیں۔

مشفق خواجہ بہت اچھے شاعر تھے، آپ کا شعری ذوق نہایت اعلیٰ اور ستھرا تھا، آپ کی شاعری میں بڑا خوبصورت آہنگ ملتا ہے اور اس میں جدت اور روایت کا بڑا حسین امتزاج پایا جاتا ہے،

چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

☆...... جانے والا جو کبھی لوٹ کے آیا ہوگا　　ہم نے اک عمر کا غم کیسے چھپایا ہوگا

☆...... قدم اٹھے تو عجب دل گداز منظر تھا　　میں آپ اپنے لیے راستے کا پتھر تھا

☆...... چہرہ تو چمک دمک رہا ہے　　اندر سے یہ شخص بجھ چکا ہے

مشفق خواجہ اردو کے جانے مانے ادیب و کالم نویس بھی تھے،" خامہ بگوش" کے قلمی نام سے آپ کا کالم "سخن در سخن" ملک و بیرون ملک آپ کی شہرت اور شناخت کا باعث بنا۔ یہ کالم اپنے زمانے میں اردو کا مقبول ترین کالم تھا اور اردو دنیا کے کئی اخبارات و رسائل میں شائع ہوا کرتا تھا، جس پرچے میں ان کا کالم شائع ہوتا، اس پرچے کی اشاعت، دو تین گنا بڑھ جاتی، کئی قارئین اس کالم کو دیکھ کر ہی رسالہ خریدتے تھے۔ جس میں وہ کسی بڑے ادیب یا اس کی کتاب پر تبصرہ کرتے، آپ اس کی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، اس میں چھپی ہوئی زبان و بیان کی خامیوں کو یوں اُجاگر کرتے کہ نکتہ آفرینی پر انھیں بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا، ان کے ادبی کالم اور کاٹ دار فقرے، ایسا پھول کہ جسے لگ جائے وہ چوٹ سہلاتا پھرتا تھا۔ آپ کئی نامور شخصیات کو بڑے پیارے اور دلچسپ انداز میں چٹکیاں لیا کرتے تھے، ان کے تحقیقی، تنقیدی و ادبی مضامین کے اب تک چار مجموعے" خامہ بگوش کے قلم سے"، "سخن در سخن"، "سخنہائے گسترانہ" اور "سخن ہائے ناگفتنی" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی شگفتہ نگاری کا ایک زمانہ قتیل ہے، چند کاٹ دار جملے ملاحظہ کیجیے:

☆......زمانہ تھا کہ لوگ دور دراز کے مقامات کے سفرنامے لکھتے تھے لیکن اب یہ حال ہے کہ بعض لوگ اپنے مکان کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہیں تو سفرنامہ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

☆......کتاب کو ایک نشست میں پڑھ ڈالا، یہ سوچ کر کہ جو گزرنی ہے، وہ ایک ہی مرتبہ گزر جائے۔

☆......ڈاکٹر انور سدید کی کتابوں میں اتنی خوبیاں ہوتی ہیں کہ انہیں کسی قسم کے زیور کی، حتیٰ کہ زیورِ طبع کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

☆......۸۰ گرام کے کاغذ پر ۲۰ گرام کی شاعری شائع کی ہے ان صاحب نے

مشفق خواجہ نے اس کے علاوہ بحیثیت مدون، مدیر، طنز و مزاح نگار، مکتوب نگار، دیباچہ نگار، تبصرہ نگار، ترجمہ نگار بھی خدمات سرانجام دی ہیں۔ ادب لکھنے اور ادب پڑھنے والا ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو مشفق خواجہ سے واقف نہ ہو۔ مولانا ابن الحسن عباسی مشفق خواجہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مشفق خواجہ صاحب دل کے دین دار اور مشرقی تہذیب کے علم بردار تھے، وہ نوے فیصد ادیبوں کے برعکس علماء، دینی مدارس اور دین داروں سے محبت کرنے والے شخص تھے، ان کے والد خواجہ عبدالوحید مرحوم، امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے مرید خاص تھے اور ان کے انگریزی رسالے کے ایڈیٹر بھی تھے، بچپن میں ان کے گھر علما اور صلحا کا آنا جانا رہتا، ایسے گھرانوں میں تربیت پانے والوں پر بہرحال دین وایمان کا اثر ہوتا ہے اور خواجہ صاحب میں یہ اثر بہت نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔“

مشفق خواجہ کی حیات وخدمات پر اب تک تین تحقیقی مقالات لکھے گئے: پہلا مقالہ شاہ نواز فاروقی نے ”مشفق خواجہ کی سیاسی فکاہیہ کالم نویسی......ایک تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ“ کے عنوان پر لکھا، دوسرا مقالہ وحید الرحمٰن نے ”خامہ بگوش کی ادبی کالم نگاری“ کے عنوان پر لکھا جبکہ تیسرا مقالہ محمد قاسم نے ”مشفق خواجہ بطور مدون“ کے عنوان پر لکھا، مقالات کے عنوان سے معلوم ہورہا ہے کہ یہ مشفق خواجہ کی شخصیت یا ان کی خدمات کے صرف ایک پہلو کو عنوان بنا کر لکھے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ پاک وہند کے کئی مجلّات نے جیسے قومی زبان، کراچی (مارچ ۲۰۰۵ء)، قومی زبان (فروری ۲۰۰۶ء)، اکابرِ صحافت (کراچی)، اکادمی بازیافت (کراچی) کے مجلہ ”مکالمہ“، ماہنامہ کتاب نما، دہلی نے ”مشفق خواجہ-ایک مطالعہ“ کے عنوان سے مشفق خواجہ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے خواجہ صاحب پر خصوصی گوشے شائع کیے، ان کے علاوہ بھی مشفق خواجہ پر لکھے گئے مضامین سینکڑوں میں ہیں لیکن آپ کی شخصیت وسوانح کا جامع احاطہ نہ ہوسکا اور اس حوالے سے تشنگی بدستور باقی رہی، یہاں تک کہ مشفق خواجہ کی وفات کے سولہ برس بعد ڈاکٹر محمود احمد کاوش کے اورینٹل کالج لاہور سے لکھے گئے پی ایچ ڈی کے ۱۰۸۲ صفحات پر مشتمل ضخیم مستند وتحقیقی مقالہ ”مشفق خواجہ: احوال وآثار“ کی اشاعت سے وہ تشنگی دور ہوئی۔ یہ مقالہ ڈاکٹر اورنگزیب عالمگیر صاحب کے زیرِ نگرانی دس سال پہلے

مکمل ہوا، اور فروری ۲۰۲۱ء میں قرطاس، کراچی سے شائع ہوا۔

ڈاکٹر محمود احمد کاوش (پرنسپل قائدِ اعظم اکیڈمی فار ایجوکیشنل ڈیویلپمنٹ، نارووال) خود بھی ایک استاد، محقق اور کئی علمی و ادبی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں "اردو اور اس کی تدریس"، "اردو کی مختصر آپ بیتیاں" (حواشی اور اضافہ)، "قافلے اجالوں کے" (شخصی خاکے) معروف ہیں۔ آپ متعلقاتِ مشفق خواجہ سے انتہائی دلچسپی رکھتے ہیں، جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ خواجہ صاحب پر کئی عنوانات سے کام کر رہے ہیں، ان میں ایک کتاب "مصاحباتِ مشفق خواجہ" شائع ہو چکی ہے، جبکہ کئی کتابیں ابھی زیرِ ترتیب ہیں، جن کے نام یہ ہیں: "نگارشاتِ مشفق خواجہ"، "مشفق خواجہ بھارتی ادیبوں کی نظر میں" اور "تحریراتِ مشفق خواجہ" (مشفق خواجہ کے غیر مدون تبصرے)، جبکہ مشفق خواجہ کی ڈاکٹر وحید قریشی اور رشید حسن خان سے مراسلت بھی زیرِ ترتیب ہے۔ مشفق خواجہ سے متعلق آپ کا سب سے بڑا، اور یادگار کارنامہ "مشفق خواجہ: احوال و آثار" ہے، ڈاکٹر محمود احمد کاوش مقدمہ میں تحریر کرتے ہیں:

> ''مشفق خواجہ ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ مبداء فیاض نے انہیں ذہنِ رسا سے خوب نوازا تھا۔ اعلیٰ درجے کے تخلیقی جوہر اور تحقیقی نظر دونوں کا کسی ایک شخصیت میں پایا جانا معجزے سے کم نہیں ہوتا۔ مشفق خواجہ کی ذات میں یہ دونوں صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اُن کی تخلیقی اُپج کو اُن کی تحقیقی ژرف نگاہی پر ترجیح دی جائے یا اُن کے تحقیقی کارناموں کو اُن کی تخلیقات سے بہتر سمجھا جائے۔ تحقیق ہو یا تدوین، شاعری ہو یا طنز و مزاح، دیباچہ نگاری ہو یا تبصرہ نگاری، ترجمہ نویسی ہو یا مکتوب نویسی...... وہ ہر جگہ اپنی انفرادیت کے جھنڈے گاڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی انہی نادر خوبیوں کی بنا پر میں انہیں "تخلیق و تحقیق" کا خواجہ لکھ رہا ہوں۔ یہ مقالہ مشفق خواجہ کی حیات اور ادبی کارناموں کا احاطہ کرنے کی ایک کوشش ہے۔''

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول اس کتاب کا امتیازی باب ہے، جس میں تین فصلیں ہیں، جو "سوانح"، "بچپن اور ادبی ماحول" اور "شخصیت" کی تحقیق پر مشتمل ہیں، ان تحقیقات کے لیے مصنف کاوش صاحب کو دو مرتبہ کراچی کا سفر کرنا پڑا، جس سے انہیں مشفق خواجہ کے متعلقین

جیسے خواجہ صاحب کے بھائی خواجہ طارق، اہلیہ، مرحومہ بہن اور معاون ناصر جاوید صاحب سے ملاقات میں انتہائی اہم اور مستند معلومات حاصل ہوئیں۔ اس باب میں مشفق خواجہ سے متعلق مشہور بعض غلط باتوں کا مدلل رد کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو ص: ۶۴، ۶۷ تا ۷۹۔ اس باب کی تیسری فصل بہت اہمیت کی حامل ہے، جو کئی ادبی لطائف، ادبی معرکوں اور ادبی بیٹھکوں کے مختصر احوال پر مشتمل ہے۔

باب دوم میں مشفق خواجہ کی تحقیقی و تدوینی خدمات پر معلومات ہیں، اس باب میں بھی تین فصلیں ہیں: پہلی فصل "اردو میں تحقیق و تدوین کی روایت"، "محقق کے اوصاف"، "تحقیق کے فائدے" اور "اردو میں تحقیق و تدوین" پر مشتمل ہے۔ فصل دوم میں مشفق خواجہ کی تحقیقی خدمات: (الف) جائزۂ مخطوطات اردو، (ب) تحقیق نامہ، (ج) پرانے شاعر نیا کلام (د) غالب اور صغیر بلگرامی، (ہ) غالب اور تلامذۂ غالب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فصل سوم: مشفق خواجہ کی تدوینی خدمات: (الف) تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا، (ب) اقبال، (ج) نگارستانِ بشیر، (د) فرمانِ سلیمانی، (ہ) صبا اکبر آبادی کے مراثی، (ز) انتخابِ میر پر مشتمل ہے۔

باب سوم: مشفق خواجہ بحیثیت طنز و مزاح نگار۔ اس میں پانچ فصلوں میں مشفق خواجہ کی طنز و مزاح نگاری پر تفصیلی بحث ہے، یہ اڑھائی سو سے زائد صفحات پر محیط، سب سے بڑا باب ہے۔ فصل اوّل: "طنز و مزاح اور اردو کالم نگاری"، دوم: "مشفق خواجہ بحیثیت طنز و مزاح نگار"، سوم: "خامہ بگوش کے تنقیدی تصورات"، چہارم: "معلوماتی، تجزیاتی اور تحقیقی کالم"، پنجم: "طنز و مزاح کا اسلوب"۔

باب چہارم: مشفق خواجہ بحیثیت شاعر۔ اس میں تین فصلیں ہیں: "اردو غزل کا پسِ منظر"، "مشفق خواجہ کی شاعری" اور "مشفق خواجہ کی غیر مدونہ شاعری"۔

باب پنجم: مشفق خواجہ بحیثیت مکتوب نگار۔ یہ چھ فصلوں پر مشتمل ہے، پہلی فصل میں مکتوب نگاری پر بحث کے بعد باقی فصلوں میں مشفق خواجہ کی مکتوب نگاری، ان کے اسلوب، زبان دانی اور ان پر تنقیدی آرا وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ باب دو سو بیس سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔

باب ششم: مشفق خواجہ کی متفرق علمی و ادبی خدمات۔ اس میں چھ فصلیں ہیں، جن میں مشفق خواجہ کی دیباچہ نگاری، تبصرہ نگاری، ترجمہ نگاری اور ادارتی خدمات وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

بابِ ہفتم: ”مشفق خواجہ کا ادبی مقام و مرتبہ“ کے عنوان سے ہے۔

کتاب کے آخر میں کتابیات کی طویل فہرست دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مقالہ کتنی محنت سے لکھا گیا ہے، کتاب میں سینکڑوں ثانوی ماخذات کے علاوہ شخصی ملاقاتوں، انٹرویوز، ٹیلی فونی رابطوں اور ویب گاہوں سے بھی ممکنہ حد تک استفادہ کیا گیا ہے۔ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر تحریر فرماتی ہیں:

”ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر کی زیرِ نگرانی کیے گئے اس سیر حاصل کام میں مشفق خواجہ کی سوانح، زندگی کے متنوع پہلو، ان کی تحقیقی و تدوینی خدمات، ادبی کالم نگاری، شاعری، مکتوب نگاری، متعلقاتِ مشفق خواجہ اور تمام تر علمی و ادبی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔علم و ادب اور تحقیق و تدوین کی اس ”جناتی“، شخصیت کا کماحقہٗ احاطہ کرنے کے لیے محمود احمد کاوش جیسے ”جناتی“ اسکالر کی ضرورت تھی......ادارۂ قرطاس سے یہ معیاری کام اس اطمینانِ قلب کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ مشفق خواجہ کی حیات و آثار کے حوالے سے یہ کتاب قارئین کو اس موضوع پر لکھی گئیں بیشتر کتب سے بے نیاز کر دے گی“۔

مصنف نے مقالہ میں کئی مقامات پر مشفق خواجہ پر ہونے والے اعتراضات کے مدلل جواب پیش کیے ہیں، ان کی ذات پر پڑے کئی پردے اتار دیئے اور کئی گرہیں کھول دی ہیں، مشفق خواجہ کے متعلق ایک غلط فہمی دور کرتے ہوئے (ص: ۲۲۳) لکھتے ہیں:

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مشفق خواجہ ادیبوں کی خامیوں کی نشاندہی کے لیے کالم لکھتے تھے، ان کے خطوں سے علم ہوتا ہے کہ ادیب فرمائشیں کر کے بھی اپنے اوپر کالم لکھواتے تھے۔ڈاکٹر مختار الدین احمد کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

”یقین کیجیے کہ اکثر لوگ فرمائشیں کر کے کالم لکھواتے ہیں اور میں جو کچھ لکھتا ہوں، اس کی شکایت کرنے کی بجائے شکر گزار ہوتے ہیں۔“

بلاشبہ یہ کتاب ادب، تحقیق و تنقید کا ذوق رکھنے والے ہر فرد کے لیے بیش بہا تحفہ ہے۔ادبی کالم نگاری اور طنز و مزاح پڑھنے والے طلبہ کو چاہیے کہ وہ اس کتاب کو بھی سبقا سبقا پڑھیں! یہ کتاب قرطاس، کراچی اور فضلی بک سنز کراچی سے حاصل کی جا سکتی ہے، رابطہ نمبر: 03213899909

کارِ جہاں بینی

جب ساری تعلیم اردو میں ہوتی تھی

رضا علی عابدی

آج کوئی مشکل ہی سے یقین کرے گا کہ جب بڑے علاقے پر انگریزوں کی حاکمیت قائم ہوگئی اور جدید علوم کی، جنہیں آپ چاہیں مغربی علوم کہہ لیں، تعلیم شروع ہوئی تو سارے مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ کیا سائنس، کیا ریاضی، کیا انجینئر نگ اور کیا زبانیں، سب اردو میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں دہلی کالج اور حیدر آباد دکن میں جو بے مثال کام ہوا، دنیا اسے بھول چلی ہے جس کا دکھ ہوتا ہے۔ جب سارے علاقے میں عوام کی بہبود کے تعمیراتی کام شروع ہوئے تو سو دو سو نہیں، ہزاروں انجینئروں کی ضرورت پڑی۔ ماہروں کی اتنی بڑی فوج انگلستان سے لانا ممکن نہ تھا۔ تب انگریزوں نے ہمالیہ کے دامن میں چھوٹے سے شہر "روڑ کی" میں ایک بڑا اور جدید سول انجینئر نگ کالج قائم کیا۔ سڑکیں اور نہریں بنانے اور عمارتیں اور تار کا نظام قائم کرنے کے لیے ہندوستانی لڑکوں کو اردو میں تعلیم دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے ماہرین کی خدمات حاصل کر کے ان مضامین کی نصابی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا گیا۔ کالج میں اردو طباعت کا چھاپہ خانہ لگایا گیا اور اس طرح یہ بڑا کام چل نکلا۔

یہاں جی چاہتا ہے اس داستان کے کچھ دل چسپ پہلو بیان کئے جائیں۔ سب سے پہلے دیسی ہیڈ ماسٹر مقرر کیے گئے۔ ریکارڈ میں ان کے نام ملتے ہیں: مُنّو لال، رام چندر، مدھوسُدن چٹر جی اور بہاری لال۔ اسی طرح نائب ماسٹروں میں مسیح اللہ، عبدالرحمان، اکبر بیگ، مودود حسین، فصیح الدین، تجمل حسین، رحیم بخش، عبدالغنی اور شیخ بیچا کے نام بھی ملتے ہیں۔ یہ سلسلہ سنہ ۱۸۴۷ سے ۱۸۷۱ تک

جاری رہا۔ ان میں کچھ سروے کے استاد تھے اور کچھ ڈرائنگ کے (میرے والد بھی نئی صدی کے آغاز میں ڈرائنگ ماسٹر ہی تھے)۔ شیخ بیچا تخمینے کے مضمون کے استاد تھے اور سترہ سال تک لڑکوں کو ایسٹیمیٹ پڑھاتے رہے۔

تھامسن انجینئرنگ کالج روڑکی میں کتابیں لکھنے اور چھاپنے کے کام پر آج کے اسکالروں نے کافی تحقیق کی ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ شروع میں ساری تعلیم لڑکوں کو انگریزی زبان میں دی جاتی تھی۔ مگر ہمارے پیش نظر کتاب کے مصنف ساجد صدیق نظامی نے بڑے وثوق سے لکھا ہے کہ یہ دونوں باتیں درست نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پہلے دن سے ہندوستانی لڑکوں کی تعلیم ہوئی اور ان کی نصابی کتابیں اردو ہی میں چھاپی جارہی تھیں۔ کالج کا اپنا چھاپہ خانہ سنہ ۱۸۵۰ کے آس پاس کام شروع کرچکا تھا۔ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ انجینئرنگ جیسے مضمون کی کتابیں ترجمہ کرنے کے لیے کالج میں ایک ترجمہ کمیٹی بھی مقرر کی گئی تھی۔ کسی نے لکھا ہے کہ آزادی تک کالج میں مسلمانوں کا داخلہ تقریباً ناممکن تھا۔ مگر کالج کے ایک پرانے کیلنڈر میں سنہ ۱۸۷۲ تک داخل ہونے والے لڑکوں کی مکمل فہرستیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمان طلبا کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ کالج کے قیام سے ۱۸۷۰ تک ہندوستانی لڑکوں کو سارے مضمون اردو میں ہی پڑھائے جاتے تھے۔ اُس وقت جدید مضامین پر کچھ کتابیں دستیاب تھیں لیکن سول انجینئرنگ کی نصابی کتابوں کا کسی نے ترجمہ نہیں کیا تھا۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اس موضوع پر بنیادی کتابوں کا ترجمہ روڑکی ہی میں شروع ہوا۔ پہلے پہلے یہ کتابیں سکندرہ (آگرہ) کے آرفن پریس میں چھپتی تھیں، بعد میں کالج کا اپنا چھاپہ خانہ قائم ہوگیا۔

کالج کی زیادہ تر کتابیں دو استادوں نے ترجمہ کیں، وہ تھے منولال اور بہاری لال۔ دونوں نے چھ چھ کتابیں اردو میں ڈھالیں۔ باقی کتابیں تیار کرنے والوں میں کنہیالال، شنبھو داس اور شیخ بیچا کے نام شامل ہیں۔ منولال دہلی کے کائستھ تھے۔ ان کے والد سوہن لال کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں انگریزوں کی مدد کے صلے میں بلند شہر کے تین گاؤں جاگیر کے طور پر ملے تھے۔ خود منولال نے پہلے آگرہ کے انگلش اسکول میں تعلیم پائی جہاں سے وہ روڑکی آگئے اور تعلیم پوری کرکے یہیں پڑھانے

لگے۔اسی دوران حیدرآباد دکن سے سالار جنگ نے روڑکی کالج کے پرنسپل کو لکھا کہ انہیں انجینئرنگ کے ایک استاد کی ضرورت ہے، جس پر منولال کو وہاں بھیج دیا گیا۔ وہ حیدرآباد انجینئرنگ کالج کے نائب سربراہ مقرر ہوئے۔منولال نے حیدرآباد میں اینگلو ورنا کیولر گرلز اسکول قائم کیا جہاں ۱۸۸۵ء میں پچاس ہندو اور چھبیس مسلمان لڑکیاں تعلیم پا رہی تھیں۔تین سال بعد منولال کی وفات ہوئی۔

دوسرے مصنف لالہ بہاری لال ہیں جو شروع ہی سے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے سات کتابیں لکھیں۔اگلے مصنف کنہیالال ہیں جن کی کتاب ’تاریخ پنجاب‘ آج تک یاد کی جاتی ہے۔وہ ۱۸۳۰ء میں ایٹہ یوپی میں پیدا ہوئے۔ثانوی درجات کی تعلیم آگرہ میں پائی جس کے بعد روڑکی میں داخلہ لیا۔تعلیم پوری کرنے پر لاہور میں سب اسسٹنٹ سول انجینئر مقرر ہوئے اور آخر وہیں ریٹائر ہوئے۔لاہور کا ریلوے اسٹیشن اور میو اسپتال ان ہی کی نگرانی میں تعمیر ہوا۔بہت کتابیں لکھیں جن میں گلزار ہندی، یادگار ہندی، ظفر نامہ معروف بہ رنجیت نامہ، مناجات ہندی، اخلاق ہندی، تاریخ پنجاب اور تاریخ لاہور آج تک حوالے کے طور پر نظر آتی ہیں۔بعد میں کالج میں ان کے نام سے ایک انعام بھی جاری ہوا تھا۔ان کی انجینئرنگ کی کتابوں میں ’رسالہ در باب آلات پیمائش‘ قابل ذکر ہے۔سڑکوں یا نہروں کی تعمیر میں بڑا موڑ آجائے تو کیا کرنا چاہئے، تفصیل سے بتایا گیا ہے۔اسی کتاب میں ایک جگہ ایسی بھی آتی ہے کہ ”جب کبھی ایسا اتفاق آپڑتا ہے کہ سڑک کی سیدھ میں کوئی گاؤں یا اچھا باغ یا کوئی مکان کہ جس کے گرا دینے میں بہت نقصان ہوتا ہو، آجاتا ہے تو اس وقت گاؤں یا مکان کو کیسے بچانا چاہئے“۔

اُس زمانے اور اُن لوگوں کے گزر جانے کے بعد حالات نے ایسی کروٹ بدلی کہ کچھ بھی پہلا جیسا نہ رہا ورنہ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ یوں بھی ہوتا کہ ہم اور ہمارے بچے دنیا کا ہر مضمون اپنی زبان میں پڑھ رہے ہوتے اور جب پڑھ رہے ہوتے تو انہیں اچھی طرح معلوم ہوتا کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ اب تو یہ کسی دیوانے کا خواب لگتا ہے۔

☆......☆......☆

ادب پارے

بابائے اردو کی شگفتہ مزاجی

ایک دفعہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ایک بے تکلف دوست نے ان سے استفسار کیا: ''مولوی صاحب! آپ خاصی عمر گزار چکے ہیں لیکن آپ نے اب تک شادی نہیں کی، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟'' مولوی صاحب نے مسکرا کر جواب دیا: ''میرے بھائی! میری شادی کو تو طویل عرصہ گزر چکا ہے۔'' دوست سخت حیرت زدہ ہوا اور بولا: ''آپ کی شادی کب ہوئی، کس سے اور کہاں ہوئی؟'' مولوی صاحب نے اپنے دوست کو کان قریب کرنے کے لیے کہا اور جب ان کا دوست جھکا تو مولوی صاحب نے اس کے کان میں کہا: ''میری شادی اُردو سے ہو چکی ہے اور اُردو ہی میری دلہن ہے۔''

بابائے اُردو مولوی عبدالحق ریل گاڑی میں سفر کر رہے تھے کہ ڈبے میں بیٹھے ہوئے کسی مغرب زدہ شخص نے ان سے کہا: ''کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟'' مولوی عبدالحق نے جواب دیا: ''جی ہاں! پوچھ سکتے ہیں۔'' اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے اور بات آئی گئی ہوگئی۔ بعد میں مولوی صاحب کے کسی عقیدت مند نے ان سے دریافت کیا: ''مولوی صاحب! آخر آپ نے اپنا نام انہیں کیوں نہیں بتایا تھا؟'' مولوی صاحب نے فرمایا: ''صاحب! گفتگو کا یہ کیا انداز ہوا؟ ہماری زبان میں اس طرح نہیں کہتے، بلکہ یوں کہتے ہیں کہ'' آپ کا اسم شریف یا جناب کا نام؟'' اِن صاحب نے اپنی روایات کو سمجھے بغیر انگریزی کے اس جملے کا محض لفظی ترجمہ کر دیا کہ May I know your name اور جتنی بات انہوں نے پوچھی، میں نے اس کا جواب دے دیا۔''

ایک مرتبہ مہاتما گاندھی نے اعلان کیا کہ وہ ۱۲۵ برس تک زندہ رہیں گے۔ اس پر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انہیں ایک خط لکھا کہ میری بھی دلی دعا یہی ہے کہ آپ ۱۲۵ برس تک زندہ رہیں تاکہ آپ نے اب تک جو غلطیاں کی ہیں، ان کی تلافی کے لیے مناسب وقت مل سکے۔''

مسافرانِ آخرت

امیر الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن ثانی لدھیانویؒ

مولانا حبیب الرحمٰن ثانی طویل علالت کے بعد ۱۰ ستمبر ۲۰۲۱ء رات ساڑھے بارہ بجے "لدھیانہ" (بھارتی پنجاب) کے مشہور ہسپتال "سی ایم سی" میں اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہو گئے۔ آپ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کے پوتے اور مولانا مفتی محمد احمد رحمانیؒ کے صاحبزادے ہیں۔ آپ ۸ مارچ ۱۹۵۸ء کو لدھیانہ کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ آپ نے مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ، مولانا عبداللہ صاحب لدھیانویؒ اور اپنے والد ماجد جیسے اساطینِ علم وفضل کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیے اور تعلیم وتربیت کے جملہ مراحل طے فرمائے۔

اس خاندان کے مورث اعلیٰ مولانا عبدالقادر لدھیانویؒ ہیں، افغانستان کے والی شاہ زمان الملک جو ۱۸۰۵ سے ۱۸۳۵ تک لدھیانہ کے حاکم رہے، انہوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور آپ کو "شاہی امام" کے لقب سے نوازا۔ مولانا حبیب الرحمٰن ثانی لدھیانویؒ اس تاریخی خاندان کے آٹھویں خوش نصیب تھے جو ۱۹۸۰ میں علما وصلحا کی ایک بڑی جماعت کی موجودگی میں "شاہی امام" کے اس منصب پر فائز کیے گئے۔ آپ نے اپنے دادا "رئیس الاحرار" کے نام وکام اور اپنے خاندان کی روشن روایات کو بہت خوب صورتی وپختگی کے ساتھ آگے بڑھایا اور مسلمانانِ ہند کی ہر محاذ پر مثالی قیادت فرمائی۔ مجلس احرار اسلامِ ہند کا ازسرِ نو احیا، قادیانیوں اور دیگر شر پسندوں کی جانب سے کئی قاتلانہ حملوں کے باوجود تحریک تحفظِ ختمِ نبوت سے مضبوط وابستگی، (بھارتی) پنجاب بھر میں مساجد کی واگزاری، لدھیانہ سینٹرل جیل میں انتہائی کوششوں سے پہلی مسجد کی تعمیر، مسجد ختم نبوت کا قیام، صد سالہ احرار کانفرنس لدھیانہ، بے غبار اور اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ موقف، ملک بھر کے مدارس وجامعات کے اکابر ومشائخ سے تعلق، ملی پارلیمنٹ میں ولولہ انگیز خطاب، جیسے آپ کے کئی اہم کارنامے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

آپ کی نمازِ جنازہ ۱۰ ستمبر ۲۰۲۱ء کو بعد نمازِ عشاء پیر جی حافظ حسین صاحب (رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) کی اقتدا میں ادا کی گئی اور تدفین جامع مسجد فیلڈ گنج، لدھیانہ کے احاطے میں ہوئی۔